www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ

Al-Risala

May-June 2024 • Rs. 40

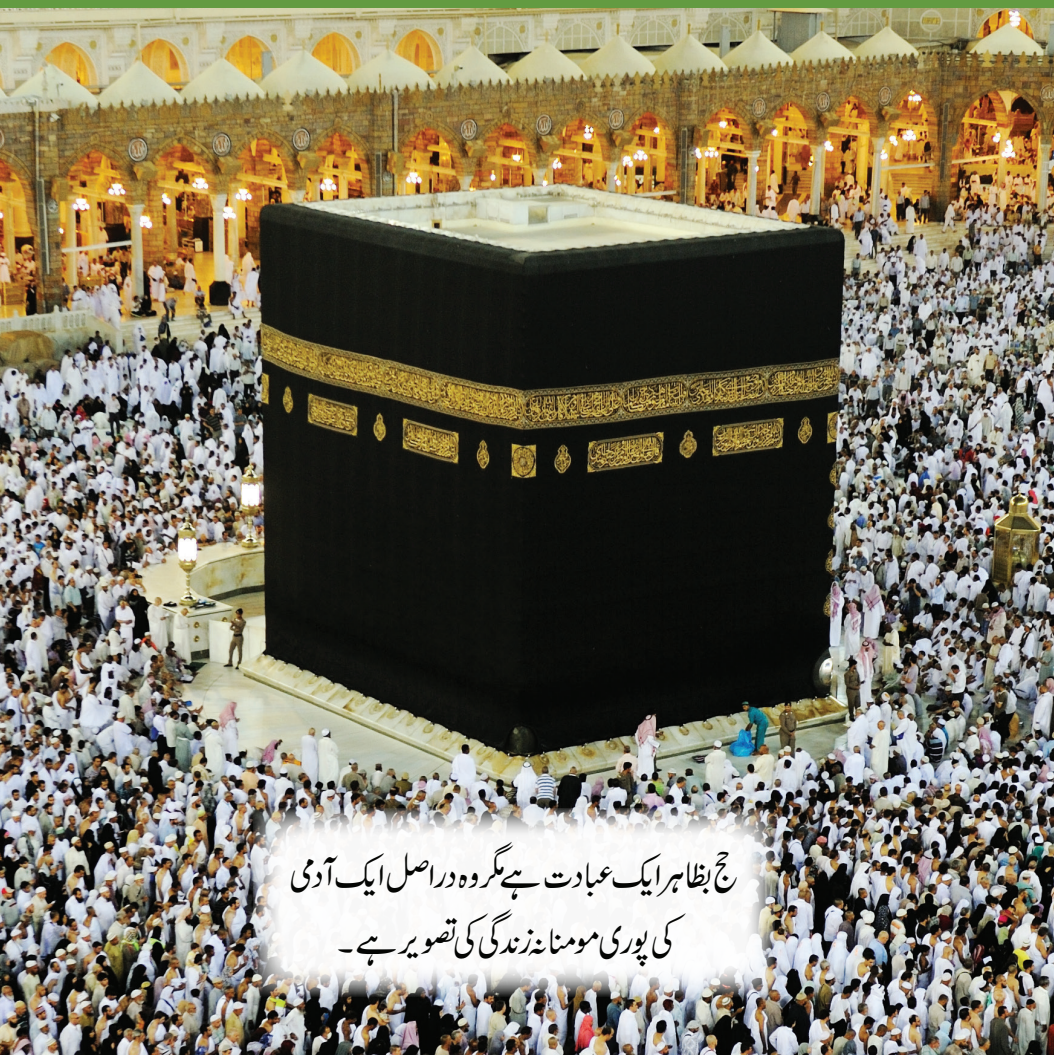

حج بظاہر ایک عبادت ہے مگر وہ دراصل ایک آدمی
کی پوری مومنانہ زندگی کی تصویر ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الرسالہ

May-June, 2024 | Volume 49 | Issue 3

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: cs.alrisala@gmail.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدین خاں

فہرست

حجۃ الوداع کا سبق	4
رمیِ جمار	7
امام رازی کا قصہ	8
بڑھاپے کا سبق	9
مطالعۂ حدیث (شرح مشکاۃ المصابیح)	10
تجرباتِ معرفت	24
ڈائری 1986	36
دورِ زوال کی علامت	49
چھوٹا آغاز	50
तजुर्बे के बाद	1
पेड़	3
मौत का फ़ैसला	5
तरतीब	6
विकासवादः एक धोखा	7
जितना देना उतना पाना	15
जिसकी शरारत का असर उसके बाद भी रहे	16

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

حجۃ الوداع کا سبق

حجۃ الوداع 10ھ میں پیش آیا۔ اس حج کو حجۃ الوداع اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس حج کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو وداع کہا تھا۔ آپ نے کہا تھا کہ شاید اس سال کے بعد آئندہ اس جگہ تم سے میری ملاقات نہ ہو سکے گی۔ اور اس کے تقریباً دو ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حج مختلف پہلوؤں سے اہل ایمان کو گائڈ کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حج کے سفر کا ارادہ کیا تو اس کی خبر عرب میں پھیل گئی اور لوگ مدینہ آنا شروع ہو گئے۔ آپ 25 ذی قعدہ 10ھ کو مدینہ سے مکہ کے لیے روانہ ہوئے۔ راستہ میں بھی لوگ اس قافلہ میں شریک ہوتے رہے۔ صحابیِ رسول حضرت جابر کہتے ہیں کہ میری نگاہ جہاں تک جاتی تھی مجھے ہر طرف انسان ہی انسان دکھائی دیتے تھے۔ مکہ پہنچ کر یہ مجمع تقریباً سوا لاکھ ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قصواء نامی اونٹنی پر سوار تھے۔ یہ ایک عمدہ قسم کی تیز رفتار اونٹنی تھی۔ تاہم اس وقت اس کے اوپر جو کجاوہ بندھا ہوا تھا، اس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہ تھی۔ گویا ضرورت کی حد تک اعلیٰ معیار، لیکن جہاں ضرورت کی حد ختم ہو جائے وہاں صرف سادگی۔

آپ 4 ذی الحجہ کو مکہ پہنچے۔ مکہ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے آپ حرم میں داخل ہوئے اور آپ نے کعبہ کا طواف کیا۔ اور یہ قرآنی دعا کی: اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو آگ کے عذاب سے بچا (2:201)۔ انسان ایک لمحہ بھی بھلائی اور خیر سے محروم ہو کر زندگی نہیں گزار سکتا ہے۔ اس لیے ہر عورت اور ہر مرد کو چاہیے کہ وہ دنیا اور آخرت دونوں کے لیے خیر کا طالب بنا رہے، اور اس کے لیے دعا کرے۔

8 ذی الحجہ کو آپ اپنے تمام اصحاب کے ساتھ منیٰ گئے۔ روانگی کے وقت کوئی طواف نہیں کیا۔ اس دن ظہر، عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں آپ نے منیٰ میں پڑھیں اور رات کو یہیں قیام کیا۔ صبح 9 ذی الحجہ کو سورج نکلنے کے بعد آپ عرفات کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ نمرہ (وادی عرنہ) کے ایک خیمہ میں اترے۔

صحابہ میں سے کوئی لبیک پکارتا تھا اور کوئی تکبیر کہتا تھا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ اس میں یہ سبق ہے کہ شریعت میں اگر کسی موقع پر ایک سے زیادہ چیزوں کے درمیان کسی ایک کو اختیار کرنے کی اجازت ہو تو اس میں سے کوئی بھی چیز اختیار کی جاسکتی ہے۔ اس آپشنل انتخاب (optional choice) کو افضل اور غیر افضل کے نام پر نزاع کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیے۔

جب آپ عرفہ سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ کے ساتھ اسامہ بن زید آپ کے پیچھے بیٹھے ہوئے تھے، اور آپ راستہ بھر تلبیہ کرتے رہے۔ مزدلفہ پہنچنے تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ آپ نے دیکھا کہ راستے میں کچھ لوگ تیز چل رہے ہیں تو آپ نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ آپ نے کہا: لوگو! سکون اور اطمینان کے ساتھ چلو۔ دوڑنا کوئی ثواب کی بات نہیں (السنن الکبریٰ للبیہقی، حدیث نمبر 9483)۔ اسی طرح آپ زندگی کے تمام معاملات میں عدم عجلت اور آسانی کو اختیار کرنے کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

حضرت اسامہ بن شُریک کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ میں تھے تو لوگ آپ کے پاس سوال پوچھنے کے لیے آتے تھے۔ کوئی شخص کہتا کہ اے خدا کے رسول، میں نے طواف سے پہلے سعی کرلی۔ کوئی کہتا کہ میں نے رمی جمار سے پہلے حلق کرالیا۔ کسی نے کہا کہ میں نے پہلے قربانی کی اور اس کے بعد رمی کیا۔ اسی طرح لوگ مختلف مسائل پوچھتے رہے۔ آپ اس قسم کے سوالات کے جواب میں فرماتے: لاَ حَرَجَ، لاَ حَرَجَ (کوئی نقصان کی بات نہیں، کوئی نقصان کی بات نہیں)۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ نے کہا: نقصان کی بات تو یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے بھائی کو بے عزت کرے، ایسا ہی شخص ظالم ہے۔ اسی نے گھاٹے والا کام کیا اور وہی ہلاک ہوا (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 2015)۔

یہ صرف حج کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ یہی سارے دین کی اسپرٹ ہے۔ ایک مرتبہ چند اعرابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کیا فلاں کام کرنے میں میرے لیے کوئی نقصان کی بات ہے، فلاں کام کو کرنے میں کوئی نقصان ہے۔ آپ نے ان سے کہا: اللہ کے بندو، اللہ نے مشکل کو دور کردیا ہے، سوائے یہ کہ کوئی انسان اپنے بھائی کی بے عزتی کرے تو یہی نقصان کی بات ہے (صحیح ابن حبان، حدیث نمبر 6061)۔ اس لیے

ایک انسان کو اپنے بھائی کے خلاف کسی بھی اقدام سے پہلے بہت زیادہ سوچنا چاہیے۔

حجۃ الوداع کا خطبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری اہم ترین تقریر ہے۔ آپ نے یہ خطبہ 9 ذی الحجہ 10ھ کو عرفات کے میدان میں دیا تھا۔ حجۃ الوداع گویا زمانۂ نبوت کا سب سے بڑا اسلامی اجتماع تھا۔ اس موقع پر تقریباً سوا لاکھ اصحابِ رسول جمع تھے۔ اس میں آپ نے ان تمام باتوں کا آخری طور پر اعلان کر دیا جس کے لیے آپ مبعوث کیے گئے تھے۔

اس خطبہ میں آپ نے جن باتوں کا اعلان فرمایا ان میں سے یہ بھی تھا۔ تمہارے خون اور تمہارے مال اور تمہاری عزتیں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح قیامت تک کے لیے قابلِ تعظیم ہیں جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارا یہ مہینہ اور تمہارا یہ شہر قابلِ تعظیم ہے۔ پھر فرمایا، میری بات سنو اور اس کے مطابق زندگی گزارو۔ خبردار، ظلم نہ کرنا۔ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت نہیں۔ اور کسی کالے کو کسی سرخ پر فضیلت نہیں اور کسی سرخ کو کسی کالے پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا معیار صرف تقویٰ پر ہے۔ تم لوگ عورتوں کے معاملے میں خدا سے ڈرو۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ اس خطبہ میں یہ بھی بتایا گیا کہ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر امانت کی ادائیگی کا احساس پیدا ہو۔

ایک اور اہم بات جو آپ نے اس خطبہ میں بتائی، وہ یہ تھی کہ جو لوگ بھی یہاں موجود ہیں، وہ میری باتوں کو ان لوگوں تک پہنچائیں، جو یہاں موجود نہیں (صحیح البخاری، حدیث نمبر 67)۔ یہ گویا آپ نے اپنے مشن کے تسلسل کو باقی رکھنے کا حکم دیا تھا۔ دوسرے الفاظ میں، اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح میں نے تم لوگوں کو خدا کا پیغام پہنچایا ہے، اسی طرح تم لوگوں کو بھی یہ نصیحت کرتا ہوں کہ تم لوگ نسل در نسل انسانوں میں خدا کے پیغام کو پہنچانے کا عمل جاری رکھنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ خطبہ گویا ایک زندہ پکار ہے۔ وہی مسلمان حقیقی معنوں میں ایمان والا ہے جو حج کی اس پیغمبرانہ نصیحت کو سنے اور اس کی پوری زندگی اس حال میں گزرے کہ یہ خطبہ اس کے لیے ایمان و تقویٰ اور انسانی خیر خواہی میں اضافہ کا ذریعہ بن گیا ہو۔ (ڈاکٹر فریدہ خانم)

(اس مضمون کی تیاری میں مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کتاب حقیقت حج سے مدد لی گئی ہے)

رمیِ جمار

رمیِ جمار کا لفظی مطلب ہے، کنکری سے مارنا۔ رمیِ جمار یا رمی، حج کا ایک عمل ہے۔ مسلمان دورانِ حج جمرات کے مقام پر تین علامتی شیطانوں کو کنکر مارتے ہیں۔ یہ حج کا ایک رکن ہے۔ دس، گیارہ اور بارہ ذوالحجہ کو یہ عمل کیا جاتا ہے، اس میں ہر حاجی پر لازم ہے کہ تین شیطانوں کو سات سات کنکر ترتیب وار مارے۔ یہ عمل اسلام میں نبی ابراہیم علیہ السلام کی سنت کے طور پر جاری ہے۔

رمیِ جمار کی حیثیت پہلے بھی علامتی (symbolic) تھی، اور آج بھی اس کی حیثیت علامتی ہے۔ رمیِ جمار کی حقیقت یہ ہے کہ جب کسی اسلامی عمل کے وقت شیطان آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالے، شیطان آدمی کو اسلامی عمل سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو انسان اس وسوسے کو جان لے۔ وہ نئے ارادے کے ساتھ اپنے اسلامی عمل کو جاری رکھنے کا عزم کرے۔ رمیِ جمار کوئی مادی واقعہ نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے ارادے کو زیادہ قوی کرنے کا ایک علامتی طریقہ ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کی ایک آیت میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (7:201)۔ یعنی جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔

موجودہ دنیا میں کوئی شخص نفس اور شیطان کے حملوں سے خالی نہیں رہ سکتا۔ ایسے موقع پر جو چیز آدمی کو بچاتی ہے وہ صرف اللہ کا ڈر ہے۔ اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ یہی حساسیت موجودہ امتحان کی دنیا میں آدمی کی سب سے بڑی ڈھال ہے۔ جب بھی آدمی کے اندر کوئی غلط خیال آتا ہے یا کسی قسم کی منفی نفسیات ابھرتی ہے تو اس کی حساسیت فوراً اس کو بتا دیتی ہے کہ وہ پھسل گیا ہے۔ ایک لمحہ کی غفلت کے بعد اس کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ اللہ سے معافی مانگتے ہوئے دوبارہ اپنے کو درست کر لیتا ہے — حساسیت آدمی کی سب سے بڑی محافظ ہے جب کہ بے حسی آدمی کو شیطان کے مقابلہ میں غیر محفوظ بنا دیتی ہے۔

امام رازی کا قصہ

امام فخر الدین رازی 1150 میں رے (ایران) میں پیدا ہوئے، اور 1210 میں ہرات (افغانستان) میں ان کی وفات ہوئی۔ کتابوں میں امام رازی کی طرف منسوب ایک واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ امام الرازی نے خدا کے وجود پر 101 دلیلیں قائم کر رکھی تھی۔ لیکن ان کی وفات کے موقع پر شیطان بزرگ آدمی کی صورت میں آیا۔ اس نے کہا: ذرا یہ تو بتاؤ خدا کو کس طرح پہچانتے ہو۔ امام صاحب نے ایک دلیل دی شیطان نے توڑ دی، دوسری دی وہ بھی توڑ دی، تیسری دلیل دی وہ بھی توڑ دی، امام صاحب نے نزع کے وقت خدا کو ماننے اور پہچاننے کی ایک سو ایک دلیلیں پیش کیں، شیطان نے سب توڑ دی۔

خواجہ نجم الدین کبری امام فخر الدین رازی کے پیر ہیں۔ خواجہ نجم الدین نے کشف کے ذریعے جانا کہ شیطان امام رازی پر نزع کے وقت حملہ آور ہے۔ خواجہ صاحب نے بذریعہ کشف وہیں سے کہا: ”رازی تو چرا نمی گوئی کہ من خدا را بلا دلیل می شناسم (تو یہ کیوں نہیں کہتا ہے کہ میں خدا کو بغیر دلیل مانتا ہوں)“۔ امام فخر الدین رازی نے جب اپنے پیر کی آواز سنی تو فورا کہا: ”شیطان میں خدا کو بغیر دلیل مانتا ہوں“۔ (امام رازی، عبد السلام ندوی، صفحہ 8)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے امام رازی کے پاس یا کسی انسان کے پاس خدا کے وجود کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر منطقی دلیل کا ایک جواب موجود ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کے وجود کے بارے میں اتنا غور کرے کہ اس کو وجدان (intuition) کی سطح پر خالق کے وجود پر یقین ہو جائے۔

مجھ پر یہ تجربہ گزرا۔ میں نے اس پر بہت زیادہ غور کیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا—خدا کو ماننا بظاہر عجیب ہے۔ مگر خدا کو نہ ماننا اس سے زیادہ عجیب ہے۔ میں جب خدا کو مانتا ہوں تو میں زیادہ عجیب کے مقابلے میں کم عجیب کو ترجیح دیتا ہوں۔ میرا یہ جواب وجدان (intuition) پر مبنی تھا۔

بڑھاپے کا سبق

فطرت کے قانون کے مطابق، انسان کے لیے مقدر ہے کہ وہ بچپن اور جوانی سے گزر کر بڑھاپے کے دور میں پہنچے۔ جو آدمی بڑھاپے کی عمر تک پہنچتا ہے، اس کو معلوم ہے کہ بڑھاپا کیا چیز ہے۔ بڑھاپا ضعف کا تجربہ ہے۔ ضعف کی حالت کیا چیز ہے، اس کا تجربہ آدمی کو بڑھاپے کی عمر میں ہوتا ہے۔ دیہات کی ایک خاتون نے اپنی دیہاتی زبان میں کہا تھا: ای انگلیا دباؤں تو پیڑا، او انگلیا دباؤں تو پیڑا (اس انگلی کو دباؤں تب بھی درد، اس انگلی کو دباؤں تب بھی درد)۔

انسان کے لیے سب سے زیادہ ناقابلِ برداشت تجربہ درد کا تجربہ ہے۔ انسان ایک ضعیف مخلوق ہے۔ اپنے اس ضعف کی بنا پر انسان درد (sorrow) کو برداشت نہیں کر پاتا۔ بڑھاپے کا یہ تجربہ اس لیے پیش آتا ہے کہ آدمی دنیا کی تکلیف کا تجربہ اٹھا کر آخرت کی ابدی تکلیف کو محسوس کرے۔ اسی لیے قرآن میں بتایا گیا ہے کہ انسان جب جنت میں پہنچے گا تو وہ کہے گا: الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ إِنَّ رَبَّنَا لَغَفُورٌ شَكُورٌ (35:34)۔ یعنی شکر ہے اللہ کا جس نے ہم سے غم کو دور کیا۔ بیشک ہمارا رب معاف کرنے والا، قدر کرنے والا ہے۔

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ أَبِي بَكْرَةَ، أَنَّ رَجُلاً قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أَيُّ النَّاسِ خَيْرٌ، قَالَ: مَنْ طَالَ عُمُرُهُ، وَحَسُنَ عَمَلُهُ، قَالَ: فَأَيُّ النَّاسِ شَرٌّ؟ قَالَ: مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَسَاءَ عَمَلُهُ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2330)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک آدمی نے دریافت کیا کہ اے خدا کے رسول، کون آدمی سب سے بہتر ہے؟ آپ نے کہا: جس کی عمر لمبی ہو، اور جس کے عمل اچھے ہوں، اس نے پھر پوچھا: کون آدمی سب سے برا ہے؟ آپ نے کہا: جس کی عمر لمبی ہو، لیکن اس کے عمل برے ہوں۔ بڑھاپا گویا ایک قسم کا جبر (compulsion) ہے۔ بڑھاپے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک اگر نہ کر سکے تو اب سے کرلو۔ اگر تم نے جوانی کو کھو دیا ہے تو اپنے آپ کو اس سے بچاؤ کہ بڑھاپا بھی تم سے کھویا جائے۔

مطالعۂ حدیث

شرح مشکاۃ المصابیح

(حدیث نمبر 145-125)

125

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب قبر میں اہل ایمان سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس بیان کا کہ "اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے" (14:27)۔ ایک اور روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ آیت عذاب قبر کے باب میں نازل ہوئی۔ اس سے کہا جائے گا کہ تمہارا رب کون ہے تو وہ کہے گا کہ میرا رب اللہ ہے اور میرے نبی محمد ہیں۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1369؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 73)

تشریح: آدمی جب مرتا ہے تو وہ اپنے جسمانی وجود کو اسی دنیا میں چھوڑ دیتا ہے، صرف اپنے روحانی وجود کے ساتھ اگلی دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ جہاں اس کو ایک نیا اور بہتر جسم عطا کیا جائے۔ جس آدمی نے اپنے روحانی وجود کو قولِ ثابت یعنی شک اور کنفیوزن سے خالی ایمان پر مضبوط کیا ہو، وہ اس بات کا مستحق ہوگا کہ اللہ اس کو اگلی دنیا میں اپنی خصوصی رحمت سے ثابت قدمی عطا فرمائے تاکہ وہ فرشتوں کے ہر سوال کا درست جواب دے سکے۔

126

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندہ جب قبر کے اندر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آنے والے لوگ واپس جانے لگتے ہیں تو وہ ان کے جوتوں کی آواز کو سنتا ہے۔ پھر اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا دیتے ہیں اور پھر اس سے پوچھتے ہیں کہ تم اس شخص (محمد) کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ پس جو مومن ہے وہ کہے گا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ پھر اس سے کہا جائے گا کہ تم دیکھو، وہ دوزخ میں تمہارا

ٹھکانا تھا۔ اس کو بدل کر اللہ نے تمھارا یہ ٹھکانا جنت میں کر دیا ہے۔ چنانچہ وہ بندہ ان دونوں ٹھکانوں کو ایک ساتھ دیکھتا ہے۔ اور جب منافق اور کافر سے کہا جائے گا کہ تم اس شخص (محمد) کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ تو وہ کہے گا کہ میں نہیں جانتا۔ میں وہی کہتا تھا جس کو لوگ کہتے تھے۔ اس سے کہا جائے گا کہ نہ تم نے جانا نہ تم نے پڑھا۔ پھر اس کو لوہے کے ہتھوڑوں سے مارا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ایسی آواز سے چیختا ہے جس کو انسان اور جنات کے سوا سب سنتے ہیں۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1338؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2870)

تشریح: میں نہیں جانتا، میں تو وہی کہتا تھا جو لوگ کہتے تھے (لَا أَدْرِي كُنْتُ أَقُولُ مَا يَقُولُ النَّاسُ) — یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ اہلِ نفاق اور اہلِ کفر کا دین وہی ہوتا ہے جو عوام کا دین ہو۔ ایسے لوگوں کا کنسرن (concern) یہ نہیں ہوتا کہ وہ حق کو جانیں اور اس کو اختیار کریں۔ ان کا سارا کنسرن یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان باعزت اور کامیاب ہوں۔ اس لیے وہ دین کے نام پر ان چیزوں کو اختیار کرتے ہیں جو عوام کے اندر دین کے نام پر رائج ہوں۔ چنانچہ وہ اپنے آپ کو عوام کی پسند پر ڈھال لیتے ہیں۔

اس کے برعکس، مومن کا کنسرن (concern) حق کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی توفیق سے دین کی براہِ راست معرفت حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے مطابق اپنی زندگی کی تعمیر و تشکیل کرتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو خدا کے یہاں عزت پائیں گے، خواہ دنیا والوں نے ان کو بے عزت سمجھ لیا ہو۔

127

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص جب مرتا ہے تو اس کو صبح اور شام اس کا ٹھکانا دکھایا جاتا ہے۔ اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنتیوں کا ٹھکانا، اور اگر وہ دوزخی ہوتا ہے تو دوزخیوں کا ٹھکانا۔ پھر کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تمھارا ٹھکانا۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن تم کو اٹھا کر وہاں پہنچا دیا جائے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 1379؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 2886)

تشریح: اس حدیث میں موت کے بعد کی جس کیفیت کا ذکر ہے اس کو انتظار کی حالت سے تعبیر

کیا جاسکتا ہے۔ مجرم کے لیے سزا سے پہلے انتظار کا لمحہ ایک قسم کی سزا ہے۔ اس کو قرآن (2:167) میں حسرت (regret) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی اس بات کا شدید احساس کہ آہ کیسا قیمتی موقع تھا، جو اس نے غفلت میں کھو دیا۔ اسی طرح اللہ کے نیک بندوں کے لیے جنت میں داخلہ سے پہلے انتظار کا لمحہ ایک قسم کا انعام ہے۔

128

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ ان کے پاس ایک یہودی عورت آئی۔ اس نے قبر کے عذاب کا ذکر کیا۔ پھر اس نے ان سے کہا کہ اللہ تم کو قبر کے عذاب سے بچائے۔ پھر عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عذاب قبر کے بارے میں سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں، قبر کا عذاب برحق ہے۔ عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو آپ ضرور قبر کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 586)

تشریح: قبر کے عذاب سے مراد موت کے بعد کا عذاب ہے، نہ کہ مقامی معنوں میں زمین کے اس گڑھے کا عذاب جہاں آدمی کو دفن کیا گیا ہے۔

129

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خچر پر سوار ہو کر بنو نجار کے باغ سے گزر رہے تھے۔ ہم آپ کے ساتھ تھے کہ اچانک آپ کا خچر بدک گیا۔ اور اس طرح بدکا کہ جیسے آپ کو گرا دے گا۔ اس وقت وہاں پانچ یا چھ قبریں نظر آئیں۔ آپ نے پوچھا کہ ان قبروں کو کوئی جانتا ہے۔ ایک صاحب نے کہا کہ ہاں، میں جانتا ہوں۔ آپ نے کہا کہ ان کی موت کب ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ شرک کی حالت میں۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ اپنی قبروں میں آزمائے جا رہے ہیں۔ اگر مجھ کو یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم لوگ دفن کرنا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے دعا کرتا کہ وہ آوازیں تم کو سنا دے جو مجھے سنائی دے رہی ہیں۔ اس کے بعد آپ نے اپنا رخ ہماری طرف کر کے فرمایا: آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے کہا کہ ہم آگ کے عذاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ

کھلے ہوئے فتنوں سے اور چھپے ہوئے فتنوں سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے کہا ہم ہر ظاہری اور باطنی فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ پھر آپ نے فرمایا کہ دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگو۔ صحابہ نے کہا کہ ہم دجال کے فتنہ سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2867)

تشریح: یہ ایک غیبی تجربہ ہے جو اللہ نے ایک مخصوص وقت پر اس لیے کرایا تا کہ وہ اہلِ ایمان کے لیے نصیحت ہو۔ اور وہ موت سے پہلے کی زندگی میں موت کے بعد کی زندگی کے لیے تیاری میں زیادہ سے زیادہ اہتمام کریں۔

فتنوں سے پناہ مانگنا کس انسان کے لیے فائدہ مند ہے۔ یہ اس انسان کے لیے فائدہ مند ہے جو اپنے اندر سیلف کریکشن کے عمل کو جاری کرے۔ سیلف کریکشن (self-correction) کا کام کوئی دوسرا شخص نہیں کرسکتا۔ یہ کام ہر آدمی کو خود کرنا پڑتا ہے۔ ہر عورت اور مرد کا پہلا فرض ہے کہ وہ اپنا محاسبہ (introspection) کرے۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے اندر سے ہر غیر ربانی آئٹم کو نکالے جو پیدائشی طور پر اس کے اندر موجود نہ تھے، لیکن بعد کو وہ ماحول کے اثر سے اس کی شخصیت کا حصہ بن گئے۔ جب کوئی شخص سنجیدگی کے ساتھ اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے گا تو اس کے بعد اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی کی فطری شخصیت پاک ہو کر سامنے آجائے۔ دنیا کے فتنہ سے پاک شخصیت کا دوسرا نام مزکّی شخصیت ہے۔

130

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مردہ جب قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے پاس سیاہ اور نیلی آنکھوں والے دو فرشتے آتے ہیں جن میں سے ایک کو منکر کہا جاتا ہے اور دوسرے کو نکیر۔ پھر دونوں فرشتے سوال کرتے ہیں کہ تم اس شخص کے بارے میں کیا کہتے تھے۔ پھر مردہ اگر مومن ہوتا ہے تو جواب دیتا ہے کہ وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ تم یہی کہو گے۔ اس کے بعد اس کی قبر لمبائی اور چوڑائی میں ستر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے۔ اور اس کے اندر روشنی کردی جاتی ہے۔ پھر اس سے کہا

جاتا ہے کہ سوجاؤ۔ وہ کہتا ہے کہ میں واپس جا کر گھر والوں کو اس کی اطلاع دے آؤں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اس دولہا کی طرح سوجاؤ جس کو اس کے متعلقین میں سے وہی جگاتا ہے جو اس کو سب سے زیادہ محبوب ہے، یہاں تک کہ اللہ اس کو اس کی خواب گاہ سے اٹھائے۔ اور مردہ اگر منافق ہوتا ہے تو وہ اس طرح جواب دیتا ہے کہ اس شخص کے بارے میں جو بات دوسرے لوگوں کو کہتے ہوئے میں سنا کرتا تھا وہی میں کہہ دیا کرتا تھا، میں اور کچھ نہیں جانتا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم جانتے تھے کہ تم یہی کہو گے۔ اس کے بعد زمین کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس مردہ کے اوپر دونوں طرف سے مل جا۔ چنانچہ زمین اس کے اوپر اس طرح مل جاتی ہے کہ اس کی دائیں پسلیاں اور بائیں ایک دوسرے کے اندر گھس جاتی ہیں اور اس کو اسی طرح برابر عذاب دیا جاتا ہے یہاں تک کہ اللہ اسے اس جگہ سے اٹھائے۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1071)

تشریح: اس حدیث میں موت کے بعد پیش آنے والے معاملہ کو تمثیل کی زبان (symbolic language) میں بیان کیا گیا ہے۔ اس قسم کی حدیثوں کو سمجھنے کے لیے تمثیلی اسلوبِ بیان کے معاملہ کو سامنے رکھنا بہت ضروری ہے۔

منافق کا جواب کہ دوسروں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا وہی میں نے کہہ دیا (سَمِعت النَّاس یَقُولُونَ فَقُلْتُ مِثْلَهُ)، منافق کی نفسیات کو بتاتا ہے۔ مومن کے دین کا سرچشمہ حق کی معرفت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، منافق کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ دوسروں کو وہ جس طریقہ پر چلتے ہوئے دیکھتا ہے اسی کو وہ بھی اختیار کر لیتا ہے۔ مومن کے سامنے خدا کی رضا ہوتی ہے اور منافق کے سامنے عوام کی رضا۔ عوام پسند بولی بولنے والے لوگ بہت جلد عوام میں مقبولیت حاصل کر لیتے ہیں، مگر آخرت کے اعتبار سے، یہ صرف ہلاکت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ دنیاوی اسٹیج پر عوام پسند بولی بولنے والے لوگ بہت جلد عوام میں ممتاز مقام حاصل کر لیتے ہیں، لیکن آخرت کے ربانی اسٹیج پر یقیناً اُن کو کوئی جگہ ملنے والی نہیں۔

131

براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: موت کے بعد آدمی

کے پاس دو فرشتے آتے ہیں۔ وہ اس کو بیٹھا کر اس سے کہتے ہیں کہ تمھارا رب کون ہے۔ وہ کہتا ہے، میرا رب اللہ ہے۔ پھر وہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ تمھارا دین کیا ہے۔ وہ کہتا ہے، میرا دین اسلام ہے۔ پھر فرشتے سوال کرتے ہیں، بتاؤ یہ کون ہے جس کو تمھارے درمیان بھیجا گیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں۔ فرشتے پوچھتے ہیں یہ بات تم کو کس نے بتائی۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے اللہ کی کتاب پڑھی تو میں اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی۔ یہی مطلب ہے قرآن کے اس ارشاد کا: "اللہ ایمان والوں کو ایک پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط کرتا ہے۔" (14:27) پھر آپ نے فرمایا کہ ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے کہ میرے بندے نے سچ کہا۔ پس تم اس کے لیے جنت کا بستر بچھا دو۔ اس کو جنت کا لباس پہنا دو اور اس کے لیے جنت کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ چنانچہ اس کے لیے جنت کی طرف کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ اور آپ نے فرمایا: پھر اس کی طرف جنت کی ہوائیں اور جنت کی خوشبوئیں آتی ہیں اور اس میں اس کی نظر پہنچنے تک کشادگی کر دی جاتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے کافر کے مرنے کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس کے جسم میں اس کی روح لوٹائی جاتی ہے اور دو فرشتے اس کے پاس آ کر اس کو بیٹھاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں کہ بتاؤ تمہارا رب کون ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہائے، میں نہیں جانتا۔ پھر فرشتے پوچھتے ہیں۔ بتاؤ تمھارا دین کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہائے، میں نہیں جانتا۔ تب ایک پکارنے والا آسمان سے پکارتا ہے کہ اس نے جھوٹ کہا۔ تم اس کے لیے آگ کا بستر بچھا دو، اس کو آگ کا لباس پہنا دو، اور اس کے لیے دوزخ کی طرف ایک دروازہ کھول دو۔ پھر اس کے لیے دوزخ کی طرف ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے جس سے اس کی طرف دوزخ کی گرم اور بدبودار ہوائیں آتی رہتی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر اس پر اس کی قبر تنگ کر دی جاتی ہے یہاں تک کہ اس کی پسلیاں ایک دوسرے میں گھس جاتی ہیں اور پھر اس پر ایک اندھا اور بہرا فرشتہ مسلّط کر دیا جاتا ہے جس کے پاس لوہے کا گرز ہوتا ہے کہ اگر اس کو پہاڑ پر مارا جائے تو پہاڑ مٹی ہو جائے۔ وہ فرشتہ اس گرز سے اس کو اس طرح مارتا ہے کہ اس مار کی آواز مشرق و مغرب کے درمیان جن و انس کے سوا ہر چیز سنتی ہے، وہ مٹی کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اس کی روح پھر اس کے جسم میں

لوٹائی جاتی ہے۔ (مسند احمد، حدیث نمبر، 18534؛ سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 4753)

تشریح: اس حدیث میں آخرت کے ایک نامعلوم واقعہ کو دنیا کی معلوم زبان میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ موت کے بعد آخرت کی دنیا میں آدمی کے ساتھ جو معاملہ پیش آئے گا وہ گویا کہ ویسا ہی ایک معاملہ ہوگا جیسے کسی کے ساتھ موجودہ دنیا میں مذکورہ قسم کے معاملہ کا پیش آنا۔ حدیث کی یہ بات متشابہات کی زبان میں بیان ہوئی ہے، نہ کہ محکمات کی زبان میں۔

حدیث میں ہے کہ سوال وجواب کے وقت مومن کہے گا کہ میں نے خدا کی کتاب پڑھی اور اس پر ایمان لایا اور اس کی تصدیق کی (قَرَأْتُ كِتَابَ اللّٰهِ فَآمَنْتُ بِهِ وَصَدَّقْتُ)۔ اس کے برعکس، غیر مومن کا جواب ہوگا کہ میں نہیں جانتا (لَا أَدْرِي)۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں "دوسروں کو جو کچھ کہتے ہوئے سنا وہی میں نے بھی کہا (اور اس کو اختیار کیا)"۔ سنن الترمذی، حدیث نمبر 1071۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک وہی دین کارآمد ہے جو براہِ راست طور پر قرآن کے مطالعہ سے اخذ کیا جائے۔ اس کے مقابلے میں وہ دین ریجکٹ ہوجائے گا جو سماجی رواج پر مبنی ہو۔ یعنی حقیقی مومن وہ ہے، جس کا دین حق کی شعوری دریافت پر مبنی ہو۔ اور غیر مومن کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں میں جس چیز کا رواج ہو اسی کو وہ اپنا دین بنا لیتے ہیں۔

132

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر کھڑے ہوتے تو وہ رونے لگتے، یہاں تک کہ ان کی داڑھی تر ہوجاتی۔ ان سے کہا گیا کہ آپ جنت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں مگر اس پر نہیں روتے۔ اور یہاں رو رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے۔ پس جو اس سے بچ گیا، تو اس کے بعد کی منزل اس کے لیے بہت آسان ہوگی۔ اور اگر وہ اس سے نہیں بچا تو بعد کی منزل اس کے لیے بہت سخت ہوگی۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے قبر سے زیادہ سخت اور زیادہ وحشت ناک منظر کوئی اور نہیں دیکھا۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2308؛ سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4267)

تشریح: اس حدیث کا تعلق قبر کی حقیقت بیان کرنے سے زیادہ اس بات پر ہے کہ کسی قبر کو

دیکھ کر ایک مومن کے اوپر کس قسم کا تاثر قائم ہونا چاہیے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ مومن کی اپنی کیفیات کا بیان ہے، نہ کہ قبر کے احوال سے۔

133

عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی میت کے دفن سے فارغ ہوتے تو آپ وہاں کچھ دیر ٹھہرتے اور فرماتے کہ اپنے بھائی کے لیے خدا سے مغفرت مانگو اور اس کے لیے ثابت قدم رہنے کی دعا کرو۔ کیوں کہ اس وقت اس سے سوال کیا جارہا ہے (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر 3221)

تشریح: اس کا مطلب غالباً یہ نہیں ہے کہ قبر کے گڑھے میں اس سے سوالات کیے جارہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا بھائی اب عمل کے مرحلہ سے گزر کر سوال کے مرحلہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اس کے لیے دعا کرو کہ اس نازک مرحلے میں وہ کامیاب ہو۔ یہاں قبر کی حیثیت علامتی ہے، نہ کہ مکانی۔

134

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کافر پر اس کی قبر میں ننانوے ازدہے مسلّط کر دیے جاتے ہیں جو اس کو نوچتے اور ڈستے رہتے ہیں، یہاں تک کہ قیامت کا دن آجائے۔ ان میں کا ایک بھی ازدھا اگر زمین پر ایک پھنکار مار دے تو زمین سبزہ اگانے کے قابل نہ رہے (الدارمی) اسی طرح کی روایت ترمذی نے بھی نقل کی ہے لیکن اس میں ننانوے کے بجائے ستر کا عدد مذکور ہے۔ (سنن الدارمی، حدیث نمبر 2815؛ سنن الترمذی، حدیث نمبر 2460)

تشریح: اس حدیث میں جس معاملے کا ذکر ہے وہ آخرت کی دنیا میں پیش آنے والا ایک معاملہ ہے۔ یہ ایک تمثیلی اسلوب ہے جس کے ذریعہ منکرینِ حق کے خوفناک انجام کو بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ انسان آسانی کے ساتھ اس حقیقت کو سمجھ سکے اور اس سے بچنے کی تیاری کرلے۔ اس قسم کی روایتوں کو اس اصول کی روشنی میں مجمل طور پر سمجھنا چاہیے۔

135

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب سعد بن معاذ نے وفات پائی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے ساتھ ان کی طرف گئے۔ جب آپ نے ان پر نماز پڑھ لی اور وہ اپنی قبر میں رکھے گئے اور ان پر مٹی برابر کر دی گئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت لمبی تسبیح پڑھی ہم نے بھی تسبیح پڑھی پھر آپ نے تکبیر کہی اور ہم نے بھی تکبیر کہی۔ عرض کیا گیا اے خدا کے رسول، اولاً تسبیح پھر تکبیر کیوں کہی۔ فرمایا اس نیک بندے پر اس کی قبر تنگ ہوگئی تھی حتیٰ کہ اللہ نے کشادہ کر دی۔ (مسند احمد، حدیث نمبر 14873)

تشریح: شیخ ناصر الدین البانی (وفات 1999) نے اس حدیث کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے۔ سعد ابن معاذ انصاری رضی اللہ عنہ ایک ممتاز صحابی تھے۔ خود مذکورہ روایت میں ان کو عبد صالح (نیک بندہ) کہا گیا ہے۔ ایسی حالت میں بظاہر یہ ناقابلِ قیاس ہے کہ ان کے اوپر عذاب کے لیے قبر تنگ ہو جائے۔

136

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (سعد بن معاذ) کی بابت فرمایا: یہ وہ ہیں جن کے لیے عرش ہلا، ان کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے۔ اور ان کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے شریک ہوئے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک بار ان کو قبر نے دبوچا پھر انھیں اس میں کشادگی حاصل ہوگئی۔ (سنن النسائی، حدیث نمبر 2055)

تشریح: حضرت سعد بن معاذ اول درجہ کے مومن اور صحابی ہیں۔ اس لیے یا تو اس روایت میں راوی سے کوئی بھول ہوئی ہے۔ یا پھر یہ ایک ایسا غیبی معاملہ ہے جس کے بارے میں عام انسان کو علم نہیں۔

137

اسماء بنت ابو بکر رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ آپ نے قبر کے اس فتنہ کا ذکر کیا جس میں آدمی مبتلا کیا جاتا ہے۔ جب آپ نے اس کا ذکر کیا تو مسلمان چیخ کر رونے لگے۔ بخاری کی روایت میں اتنا ہی ہے۔ نسائی نے اسماء رضی اللہ عنہا کے یہ الفاظ بھی نقل کیے ہیں کہ: یہ صورت حال میرے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور سمجھنے میں مانع ہوگئی۔ پھر جب لوگوں کے رونے اور چیخنے کی آواز بند ہوئی تو میں نے اپنے قریب کے آدمی سے پوچھا کہ اے فلاں شخص اللہ تم کو برکت دے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ

کے آخر میں کیا فرمایا۔ اس نے بتایا، آپ نے فرمایا کہ مجھ پر یہ وحی نازل ہوئی ہے کہ تم اپنی قبروں میں جس فتنہ میں مبتلا ہوں گے وہ دجال کے فتنہ سے قریب ہوگا۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1373؛ سنن النسائی، حدیث نمبر 2062)

تشریح: یہ رونے والے لوگ سب کے سب اصحابِ رسول تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مومن اگر صالح اور باعمل ہو اور اس کی نیت درست ہو تب بھی وہ آخرت کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ سچا مومن اندیشہ کی نفسیات میں جیتا ہے، نہ کہ سکون کی نفسیات میں۔

138

جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب مردہ، قبر میں رکھا جاتا ہے تو سورج اس کو ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی آنکھ ملتا ہوا اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھے چھوڑو، میں نماز پڑھ لوں۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4272)

تشریح: اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کی نفسیات کا تسلسل موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ جو آدمی موجودہ دنیا میں خدا کی یاد میں جیتا ہو، اس کی یہ نفسیات موت کے بعد بھی اس کے اندر باقی رہے گی۔ اس کے برعکس، جو آدمی غیر خدا میں جی رہا ہو وہ موت کے بعد بھی بدستور اسی حالت میں مبتلا رہے گا۔

139

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مردہ قبر میں پہنچتا ہے، جب نیک انسان اپنی قبر میں بٹھایا جاتا ہے، وہ نہ گھبراتا ہے اور نہ پریشان ہوتا ہے۔ پھر اس سے سوال کیا جاتا ہے کہ بتاؤ تم کس دین پر تھے۔ وہ کہتا ہے کہ میں اسلام پر تھا۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ کون شخص ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ محمد، اللہ کے رسول جو ہمارے پاس اللہ کے یہاں سے کھلی دلیلیں لے کر آئے۔ ہم نے ان کو مانا۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ کیا تم نے اللہ کو دیکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اللہ کو دیکھنا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ پھر اس کے لیے دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ دوزخ کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کو تہس نہس کر رہا ہے۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو، اس سے اللہ نے تم کو بچا لیا۔ پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک کھڑکی کھول دی جاتی ہے جس سے وہ جنت کی رونق اور

اس کی نعمتوں کو دیکھتا ہے، اس سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تمھارا ٹھکانا ہے جو تم کو تمھارے اس یقین پر ملے گا جس پر تم تھے۔ اسی پر تمھاری موت آئی، اسی پر ان شاء اللہ تعالیٰ تمھیں اٹھایا جائے گا۔ (اس کے برعکس) برا شخص اپنی قبر میں گھبرایا ہوا اور پریشان حال اٹھ کر بیٹھتا ہے۔ اس سے کہا جاتا ہے کہ تم کس دین پر تھے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھ کو معلوم نہیں۔ پھر اس سے پوچھا جاتا ہے کہ بتاؤ یہ شخص کون ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے لوگوں کو ایک بات کہتے ہوئے سنا تو میں نے بھی کہہ دیا۔ پھر اس کے لیے جنت کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے جس سے وہ جنت کی رونق کو اور جو کچھ اس میں ہے اس کو دیکھتا ہے۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو یہ وہ جگہ ہے جس کو اللہ نے (تمھارے برے عمل کی وجہ سے) تم سے پھیر دیا ہے۔ پھر اس کے لیے دوزخ کی طرف ایک کھڑکی کھولی جاتی ہے جس سے وہ دیکھتا ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تہس نہس کر رہا ہے۔ اب اس سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو یہ تمھارا ٹھکانا ہے جو تم کو تمھارے اس شک کی بنا پر ملے گا جس میں تم مبتلا تھے۔ اسی شک کی حالت میں تمھاری موت آئی اور، ان شاء اللہ، اسی حالت میں تمھیں اٹھایا جائے گا۔ (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 4268)

تشریح: حق ہمیشہ دلیل کی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ کامیاب انسان وہ ہے جو دلیل کی صورت میں ظاہر ہونے والے حق کو پہچانے اور کامل یقین کے ساتھ اس کو اختیار کر لے۔ دوسرا انسان وہ ہے جو دلیل کی صورت میں حق کو پہچاننے میں ناکام رہے۔ جو دلائل کے باوجود برابر شک میں مبتلا رہے۔ پہلے انسان کے لیے جنت ہے اور دوسرے انسان کے لیے جہنم۔

140

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو شخص ہمارے اس دین میں ایسی بات نکالے جو اس میں نہ ہو تو وہ باطل ہے۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 2697؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1718)

تشریح: اسی کو بدعت (innovation) کہتے ہیں۔ اسلام میں اجتہاد جائز ہے، مگر اسلام میں بدعت جائز نہیں۔ اجتہاد بدلے ہوئے حالات میں اسلامی تعلیم کے ازسرِنو انطباق (reapplication) کا نام ہے۔ اس کے برعکس، بدعت یہ ہے کہ دین میں کوئی ایسی نئی بات نکالی جائے جو قرآن وحدیث سے ثابت نہ ہو۔ بدعت کی ایک مثال قرآن کے مطابق، رہبانیت (57:27) ہے۔

رہبانیت کا مطلب ہے دنیا کی محبت سے بچنے کے لیے خود دنیا کو چھوڑ دینا۔ مگر خدا کے دین میں ترکِ دنیا کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ صحیح خدائی دین یہ ہے کہ آدمی دنیا میں رہے، مگر وہ دنیا کی محبت میں مبتلا نہ ہو۔ اس مثال سے بدعت کی دوسری قسموں کو سمجھا جا سکتا ہے۔

141

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: بلا شبہ اللہ کا کلام سب سے بہتر کلام ہے اور سب سے بہتر طریقہ محمد کا طریقہ ہے اور سب سے بری چیز وہ باتیں ہیں جو نئی نکالی جائیں۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 867)

تشریح: بدعت کیوں سب سے بڑی برائی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بدعت خدا کے دین میں ایک انسانی اضافہ ہے۔ بدعت دراصل یہ ہے کہ غیر دینی طریقے کو دینی کا نام دے کر اختیار کر لیا جائے۔ اس قسم کا اضافہ ایک مجرمانہ جسارت بھی ہے اور صراطِ مستقیم سے بھٹکنا بھی۔ یہود و نصاریٰ اپنے دورِ زوال میں جن برائیوں میں مبتلا ہوئے، اُن میں سے ایک برائی وہ ہے جس کو قرآن میں مُضاہاۃ (9:30) کہا گیا ہے۔ مضاہاۃ کے لفظی معنی مشابہت (imitation) کے ہیں، یعنی غیر دینی طریقے کو دین کا لیبل لگا کر اختیار کر لینا۔ مثلاً غیر مسلموں کے یہاں خدا کی پرستش کے بجائے بتوں کی پرستش کا رواج ہے، اِس سے متاثر ہو کر اس روش کو اختیار کر لینا، اور اس کو بزرگانِ دین کی پیروی یا تعظیم کا نام دے دینا، وغیرہ۔ بدعت کے تمام طریقے اِسی مضاہاۃ کی فہرست میں شامل ہیں۔

142

عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے نزدیک لوگوں میں سب سے زیادہ مبغوض لوگ تین ہیں — حرم میں بے دینی کرنے والا اور اسلام میں جاہلی طریقہ چاہنے والا۔ اور کسی انسان کے خونِ ناحق کا طلبگار، تاکہ وہ اس کا خون بہائے۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 6882)

تشریح: جرم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو بشری کمزوریوں کے تحت سرزد ہوں۔ دوسرا وہ جو انانیت کی بنا پر کیا جائے۔ اس دوسرے قسم کے جرم کا نام سرکشی ہے، اور سرکشی بلا شبہ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ سنگین جرم ہے۔

خالق نے انسان کو ایک استثنائی صلاحیت دی ہے، یعنی انا (ego)۔ یہ صلاحیت انسان کو پوری کائنات میں ایک خصوصی درجہ عطا کرتی ہے۔ لیکن انا کے دو پہلو ہیں — پلس پوائنٹ اور مائنس پوائنٹ۔ اجتماعی زندگی، خواہ وہ خاندانی زندگی ہو، یا خاندان سے باہر کی زندگی، اُس میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ساتھ ایسے تجربات پیش آتے ہیں کہ اس کا ایگو (انا) جاگ اٹھتا ہے۔ اِس طرح کے موقع پر اگر ایسا ہو کہ انسان اپنے آپ کو کنٹرول کرے، وہ ایگو مینجمنٹ (ego management) کا ثبوت دے، تو گویا کہ اُس نے اپنے ایگو کا صحیح استعمال کیا۔ اور اگر ایسا ہو کہ جب اس کا ایگو بھڑکے تو اس کی پوری شخصیت اُس سے متاثر ہو جائے۔ ایسی حالت میں وہ سرکشی کے راستے پر چل پڑے گا۔ یہ اس کے لیے ایگو مینجمنٹ میں ناکام ہونے کا واقعہ ہوگا۔

143

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری ساری امت جنت میں جائے گی سوا اس کے جس نے انکار کیا۔ کہا گیا کہ کون ہے جس نے انکار کیا۔ آپ نے فرمایا کہ جس شخص نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوگا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7280)

تشریح: پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عقیدہ و عمل کا وہ طریقہ بتایا ہے جو اس آخرت میں نجات کا ضامن ہے۔ جنت میں وہی شخص داخل ہوگا جو اس پیغمبرانہ طریقہ کا پیرو بنے۔

144

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس فرشتے آئے جب کہ آپ سو رہے تھے۔ انھوں نے (آپس میں) کہا کہ اِن کی ایک مثال ہے وہ بیان کرو۔ بعض فرشتوں نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں۔ اور بعض نے کہا کہ (ان کی) آنکھ سو رہی ہے اور دل بیدار ہے۔ پھر انھوں نے کہا کہ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص ایک گھر بنائے اور اس میں وہ ایک دسترخوان رکھے اور بلانے والے کو بھیجے۔ جو داعی کی پکار پر لبیک کہے گا وہ گھر میں آئے گا اور دسترخوان سے کھائے گا۔ اور جو داعی کی پکار پر لبیک نہ کہے گا وہ نہ گھر کے اندر داخل ہوگا اور نہ دسترخوان سے کھائے گا۔ پھر انھوں نے کہا کہ ان کے لیے اس کی وضاحت کر دو تا کہ وہ اس کو سمجھ

جائیں۔ ان میں سے بعض نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں۔ ان میں سے بعض نہ کہا کہ آنکھ سو رہی ہے اور دل بیدار ہے۔ انھوں نے کہا کہ وہ گھر جنت ہے اور داعی محمد ہیں۔ پس جس نے محمد کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے محمد کی نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور محمد لوگوں کے درمیان فرق کرنے والے ہیں۔ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 7281)

تشریح: پیغمبر اسلام کا لایا ہوا دین گویا رزق ربانی کا ایک دسترخوان ہے۔ جو آدمی اس دسترخوان سے اپنا رزق لے وہی کامیاب ہے اور جو اس رزق سے محروم رہے وہی ناکام ہے۔ اس حقیقت کی طرف قرآن میں ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے: تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے (20:131)۔

145

انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ تین آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے پاس آئے۔ انھوں نے ان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت کے بارے میں سوال کیا۔ تو ان کو جب اس کی بابت بتایا گیا تو گویا کہ انھوں نے اسے کم سمجھا۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا نسبت۔ ان کے اگلے پچھلے تمام گناہ اللہ تعالیٰ نے بخش دیے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ میں تو ساری رات نماز پڑھوں گا اور دوسرے نے کہا کہ میں ہر دن روزہ رکھوں گا اور کبھی افطار نہ کروں گا۔ تیسرے نے کہا کہ میں عورت سے الگ رہوں گا اور میں کبھی نکاح نہ کروں گا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس آئے اور کہا کہ کیا تم ہی وہ لوگ ہو جنھوں نے ایسا اور ایسا کہا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کی قسم، میں تم سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ مگر میں روزہ رکھتا ہوں اور روزہ نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح کرتا ہوں۔ پس جس نے میرے طریقہ سے اعراض کیا وہ مجھ سے نہیں۔ (متفق علیہ: صحیح البخاری، حدیث نمبر 5063؛ صحیح مسلم، حدیث نمبر 1401)

تشریح: اسلامی عبادت یہ نہیں ہے کہ آدمی پُرمشقت اعمال کے ذریعہ اپنے جسم کو تھکائے بلکہ اسلامی عبادت یہ ہے کہ آدمی اللہ کی طرف متوجہ ہو اور اپنی روح کو اللہ کی محبت اور اللہ کے خوف سے آباد کرے۔ اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: اللہ کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ (22:37)

تجرباتِ معرفت

(زیرِ نظر مضمون مولانا وحید الدین خاں صاحب کے اسفار اور ڈائری سے منتخب ہے)

خالق کی شہادت

ایک مرتبہ میں نے آل انڈیا ریڈیو کھولا تو اس میں ایک گانا آرہا تھا۔ اس کی ایک لائن یہ تھی:

جس کی رچنا اتنی سندر ہو، وہ کتنا سندر ہوگا

شاعر نے یہ مصرعہ اپنے مفروضہ محبوب کی نسبت سے کہا ہے، لیکن یہ مصرعہ زیادہ حقیقی طور پر پورے عالمِ تخلیق کے لیے درست ہے۔ تخلیق کا ہر جُزء بے حد بامعنی ہے۔ ہر چیز اپنے ماڈل کے اعتبار سے فائنل ماڈل پر ہے۔ ایسی ایک کائنات کو دیکھ کر ہر سنجیدہ انسان اِس احساس میں غرق ہو جاتا ہے کہ جس ہستی کی تخلیق اتنی زیادہ کامل ہے، وہ خود کتنا زیادہ کامل ہوگا۔

خدا کا احساس

ایک مسلم نوجوان سے ملاقات ہوئی۔ وہ دہلی کی ایک یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں ایک فکری مسئلے سے دو چار ہوں۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی، میرا ذہنی سکون ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ میں خدا کو مانتا ہوں، لیکن میں خدا کو محسوس نہیں کر پاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ خدا کو احساس (feeling) کے ذریعے میں اپنی زندگی میں شامل کروں۔ اِس کی تدبیر کیا ہے۔ میں نے کہا کہ احساس سے پہلے ایک پری احساس (pre-feeling) درکار ہے، یعنی مطالعہ اور غور و فکر۔ آپ اپنے مطالعہ کو بڑھائیے۔ اِس کے بعد آپ کو اِس مسئلے کا حل معلوم ہو جائے گا۔

جب آپ غور کریں گے تو پائیں گے کہ آپ کو اپنی ماں سے جو تعلق ہے، وہ ٹکنکل نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ وہ احساس (feeling) کے درجے میں ہے۔ کیوں کہ آپ نے یہ حقیقت شعوری سطح پر دریافت کی ہے کہ میری ماں نے میرے ساتھ شفقت کا معاملہ کیا ہے۔ اس کے برعکس، ماں سے سینکڑوں گنا زیادہ شفقت اللہ تعالیٰ کی آپ کے اوپر ہے۔ پھر کیوں ایسا ہے کہ ماں کو تو آپ نے احساس کے درجہ میں پایا ہے، مگر خدا کو احساس کے درجہ میں نہ پا سکے۔ اس

کا سبب یہ ہے کہ آپ نے ماں کی شفقت کو دریافت کیا، جب کہ آپ خدا کی شفقتوں سے شعور کی سطح پر بے خبر رہے۔

انسان کی زندگی

ایک سفر میں، میرا جہاز دہلی سے روانہ ہو کر منزل کی طرف پرواز کرنے لگا۔ وہ رُکے بغیر مسلسل اڑ رہا تھا۔ گھڑی کی سوئی بھی برابر آگے بڑھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ روانگی کے ٹھیک ایک گھنٹہ اور 50 منٹ پر اناؤنسر نے اعلان کیا کہ اب ہم پونے کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں۔

میں نے یہ الفاظ سنے تو مجھے محسوس ہوا جیسے اناؤنسر یہ کہہ رہا ہو کہ جہاز کی پرواز کی آخری حد آگئی۔ پھر میں نے سوچا کہ مختلف جہازوں کی مختلف حد ہوتی ہے۔ کوئی جہاز آدھ گھنٹہ اڑ کر اتر جاتا ہے کوئی ایک گھنٹہ اور کوئی دو گھنٹہ اور کوئی دس گھنٹے اڑنے کے بعد نیچے اترتا ہے۔

ٹھیک یہی معاملہ انسان کا بھی ہے۔ ایک شخص پیدا ہوتے ہی مرجاتا ہے۔ گویا اس کے جینے کی حد چند منٹ یا چند گھنٹے تھی۔ اسی طرح کوئی شخص چند سال گزار کر مرتا ہے۔ کوئی جوانی میں مرجاتا ہے۔ اور کوئی بوڑھا ہو کر مرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمر موت کی عمر ہے۔ آدمی کا ہر لمحہ اس کا آخری لمحہ ہے۔ ہر وقت آدمی اپنی آخری حد پر کھڑا ہوا ہے۔ زندگی کا یہ معاملہ اتنا عجیب ہے کہ آدمی اگر اس کو سوچے تو پُرعیش محل میں بھی اس کی زندگی بے عیش ہو کر رہ جائے۔

آخرت کا ٹکٹ

میرے ساتھ بار بار ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ میں ٹکٹ کے باوجود سفر نہ کر سکا۔ مثلاً ایک بار میرے پاس لمبے عالمی سفر کا ٹکٹ تھا۔ کسی وجہ سے مجھے اپنے سفر کو مختصر کرنا پڑا۔ میں نے ٹکٹ کی بچی ہوئی رقم کا واؤچر بنوالیا جو اس کے بعد کئی سفروں میں کام آیا۔ آخر میں میرے پاس دہلی- بمبئی (ممبئی) کا رٹرن ٹکٹ تھا۔ اس ٹکٹ کو دوبارہ رقم کی صورت میں تبدیل نہیں کیا جاسکتا تھا۔ صرف سفر ہی میں اس کو استعمال کرنا ممکن تھا۔ مگر ایسے حالات پیش آتے رہے کہ میں بمبئی کا سفر نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ ٹکٹ کی مدت آخری طور پر ختم ہوگئی اور وہ استعمال کے قابل نہ رہا۔

تھوڑی دیر کے لیے احساس ہوا کہ ایک ٹکٹ بلاوجہ ضائع ہو گیا۔ مگر جلد ہی میرے اندر ایک نیا احساس جاگ اٹھا۔ میری زبان سے نکلا "خدایا، میں اس ٹکٹ کو دنیا کے سفر کے لیے استعمال نہ کر

سکا۔تو اپنی رحمت سے اس کو میرے لیے آخرت کا ٹکٹ بنا دے"۔اس کے بعد نقصان کا احساس جاتا رہا اور دل میں ایک قسم کا سکون پیدا ہو گیا۔

پوائنٹ آف ریفرنس

2 نومبر 1991 کو گھر سے نکل کر پونے کے سفر کے لیے ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا تو انسانی تاریخ کا نقشہ میرے ذہن میں گھومنے لگا۔موجودہ زمانہ میں سفر کی صورت یہ ہوتی ہے کہ آدمی اپنے گھر سے نکلتا ہے۔وہ سواری پر بیٹھ کر پختہ سڑکوں سے گزرتا ہوا اسٹیشن یا ایئر پورٹ پہنچتا ہے۔وہاں اس کے لیے ایک اور سواری موجود ہوتی ہے جو اس کو لے کر تیزی سے آگے روانہ ہوتی ہے اور اس کو اس کی منزل تک پہنچا دیتی ہے۔منزل پر دوبارہ یہی سارے انتظامات ہوتے ہیں جن کو استعمال کر کے وہ اپنے آخری مطلوب مقام پر پہنچ جاتا ہے۔

چند ہزار سال پہلے انسانی زندگی اس سے بالکل مختلف تھی۔انسان نیم حیوانات کی طرح جنگلوں میں رہتا تھا۔اس کے بعد دھیرے دھیرے ترقی شروع ہوئی۔یہاں تک کہ شہری زندگی کا وہ دور آ گیا جس کو مدنیت (urbanization) کہا جاتا ہے۔مسلم عہد سے پہلے یہ رفتار بہت سست تھی۔مسلم عہد میں انسانی تہذیب نہایت تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھی۔آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمانوں نے بغداد کی جس طرح تعمیر کی وہ ماضی کے شہروں سے اتنا مختلف ہے کہ وہ شہری تاریخ میں ایک چھلانگ معلوم ہوتا ہے۔

اَربن پلاننگ کے پروفیسر ایگلی (Ernst Arnold Egli) نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قرآن میں جنت کی زندگی اور جنت کے مکانات کا جس طرح بار بار ذکر کیا گیا ہے، اس نے مسلمانوں کے اندر عمدہ مکانات اور اعلیٰ تمدن کے بارے میں ایک خیالی تصویر (dream image) بنائی۔انھوں نے اس خیالی تصویر کو واقعہ بنانے کی کوشش کی۔اس کے نتیجہ میں مسلم دنیا کے جدید شہر وجود میں آ گئے۔(*Encyclopedia Britannica*, Vol. 18, p. 1071)

مسلم تاریخ کے ان واقعات کو مسلمانوں کے لکھنے اور بولنے والے عام طور پر قومی فخر کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔وہ اس کو مسلمانوں کے پُرفخر کارنامہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔حالاں کہ ان کو آلاء اللہ کے طور پر بیان کیا جانا چاہیے۔

اس دنیا کی ہر ترقی اصلاً امکانات قدرت کو ظہور میں لانے کا نام ہے۔ انسان ان امکانات کو ایجاد کرنے والا نہیں، وہ صرف ان کو استعمال کرنے والا ہے۔ جب ایسا ہے تو ہم کو چاہیے کہ ان ترقیوں کو دیکھ کر ہم خدا کے گیت گائیں، نہ کہ ان کو خود اپنے خانہ میں ڈال کر فخر اور ناز کرنے لگیں۔

خدا کی سنت: قانونِ تدریج

دہلی سے پونے 1600 کلومیٹر دور ہے۔ قدیم زمانہ میں دہلی سے پونے پہنچنے کے لیے 16 دن سے بھی زیادہ وقت درکار تھا۔ مگر آج یہ سفر صرف دو گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے۔ 2 نومبر 1991 کو میں نے عصر کی نماز دہلی (نظام الدین) کی کالی مسجد میں ادا کی۔ مغرب کی نماز دوبارہ دہلی ایئر پورٹ پر پڑھی اور عشاء کی نماز کے وقت میں پونے پہنچ چکا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دو پیروں کے ساتھ پیدا کیا تا کہ وہ چل سکے۔ پھر اس کو گھوڑا دیا جو گویا سواری کی زندہ مشین ہے۔ اس کے بعد انسان پر اسٹیم اور پٹرول کی طاقت منکشف کی جس کے نتیجہ میں ٹرین اور کار بنے۔ اور آخر میں ہوائی جہاز جیسی تیز رفتار سواری اس کو عطا کی۔

اس تدریجی طریق کار کے نتیجہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبروں میں سے کسی بھی پیغمبر کے لیے کار اور ہوائی جہاز پر بیٹھنا ممکن نہ ہو سکا۔ پیغمبر تمام انسانوں میں سب سے زیادہ مقدس لوگ تھے۔ مگر ان کے تمام تر تقدس کے باوجود خدا نے ان کے لیے اپنے قانونِ تدریج (law of gradualism) کو نہیں توڑا۔ اس سے خدا کی سنت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تدریج اس دنیا کے لیے خدا کا اٹل قانون ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے، اور کسی کے لیے بدلا نہیں جاتا۔

فئۃ قلیلۃ

پونے کے سفر (1991) کا واقعہ ہے۔ روزانہ صبح اور شام کو مقامی احباب رہائش گاہ پر آتے رہے اور ان سے سوال و جواب کی صورت میں گفتگو ہوتی رہی۔ ایک سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ ہندستان کے مسلمانوں کے بارے میں مَیں انتہائی پُر امید ہوں۔ ان کے بارے میں قرآن کی یہ آیت صادق ہوتی نظر آتی ہے: كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ (2:249)۔ یعنی، کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں خدا کا یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ایسا ہوتا ہے کہ فئۃ قلیلہ اکثر فئۃ کثیرہ پر غالب آتا ہے۔ ایک عرصہ تک مسلمان سیاسی جوش وخروش میں اپنی قوتیں ضائع کرتے رہے۔ اب حالات کا دباؤ مسلمانوں کو صحیح رخ دے رہا ہے۔ وہ سیاست کے محاذ سے ہٹ کر تعمیر کے میدان میں سرگرم عمل ہو رہے ہیں۔

تکلیف اور استطاعت

ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ کہتے ہیں کہ اس وقت ہم "مکی دور" میں ہیں اور ہم مکی دور میں اترنے والے احکام کے مخاطب ہیں۔ آپ کس بنیاد پر ایسا کہتے ہیں جب کہ اب مکمل قرآن اتر چکا ہے اور وہ آج مکمل صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

میں نے کہا کہ یہ بات قرآن کے اصول تکلیف سے نکلتی ہے۔ قرآن کے متعلق الفاظ یہ ہیں: لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (2:286)۔ یعنی، اللہ کسی پر ذمہ داری نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی مسلمان یا کسی جماعت کے اوپر قرآن کے احکام کا انطباق باعتبارِ وسعت ہے، نہ کہ باعتبارِ تنزیل۔ حج اور زکوۃ کے احکام اتر چکے ہیں۔ مگر ان احکام کی فرضیت صرف ان افراد کے اوپر ہے جو اس کی استطاعت رکھتے ہوں۔ یہی معاملہ تمام احکام کا ہے۔ آدمی جس حکم کی تعمیل کی استطاعت رکھتا ہو اس کا وہ مکلف بن جائے گا۔ اور جس حکم کی وہ استطاعت نہ رکھتا ہو اس کا وہ مکلف نہیں بنے گا۔

مشکلاتِ حاضرہ، امکاناتِ حاضرہ

6 نومبر کو مغرب اور عشاء کی نماز کے بعد پونے کی مکہ مسجد میں عمومی خطاب ہوا۔ موضوع رکھا گیا تھا: حالات حاضرہ اور مسلمان۔ میں نے کہا کہ اس عنوان کا میرے نزدیک دو پہلو ہے۔ ایک، مشکلات حاضرہ اور مسلمان۔ اور دوسرا، امکانات حاضرہ اور مسلمان۔ اس کے بعد تفصیل سے میں نے بتایا کہ بلاشبہ ہمارے لیے کچھ مشکلات ہیں۔ مگر اس قسم کی مشکلات ہر سماج میں اور ہر ملک میں ہمیشہ رہتی ہیں۔ مزید مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ امکانات کی مقدار مشکلات کی مقدار سے ہمیشہ بہت زیادہ ہوتی ہے اور آج بھی بہت زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں ہم کو پریشان ہونے کے بجائے

امکانات کو تلاش کر کے اس کو استعمال (avail) کرنا چاہیے۔

مطالعہ کا درست طریقہ

ایک تعلیم یافتہ عیسائی نے کہا کہ میں نے اسلام کا مطالعہ شروع کیا ہے۔ مگر بعض سوالات میرے ذہن کو الجھا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ وہ کون سے سوالات ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسلام میں غلامی کا مسئلہ، پیغمبر کا کئی شادیاں کرنا، حجرِ اسود کو چومنا، وغیرہ۔

میں نے کہا کہ اسلام یا کسی بھی نظام کا مطالعہ کرنے کا یہ طریقہ درست نہیں۔ ہر مذہب یا ہر نظام میں کچھ بنیادی چیزیں ہوتی ہیں اور کچھ فروعی چیزیں۔ ایک سنجیدہ متلاشی کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ پہلے زیر مطالعہ مذہب یا نظام کی بنیادی باتوں کو سمجھنے کی کوشش کرے جب ان کے بارے میں پوری واقفیت حاصل ہو جائے، اس کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ فروعی یا ضمنی باتوں کو سمجھا جائے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ امریکہ کے نظامِ تہذیب کو سمجھنا چاہیں تو اس کا آغاز آپ یہاں سے نہیں کریں گے کہ امریکہ کے سابق صدر رونالڈ ریگن اپنی جیب میں ہمیشہ سونے کی نعل کیوں رکھتے تھے۔ مطالعہ کا یہ طریقہ درست نہ ہوگا۔ اس کے برعکس، آپ یہ کریں گے کہ پہلے امریکہ کی تاریخ، اس کے علوم، اس کے قانون اور اس کے صنعتی اور تجارتی طریقوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ یہی طریقہ علمی طریقہ ہے اور یہی طریقہ آپ کو اسلام کے مطالعے میں بھی اختیار کرنا چاہیے۔

ہوائی جہاز اور سیارۂ زمین

27 نومبر 1994 دہلی سے ایئر فرانس کی فلائٹ نمبر 177 کے ذریعہ اسپین کا سفر ہوا۔ ہوائی جہاز کی سواری مجھ کو ایک خدائی نشانی نظر آتی ہے۔ ہوائی جہاز کی ایک عجیب صفت یہ ہے کہ وہ انسان کی اُس کمزوری (vulnerability) کو عملی شکل میں ظاہر کرتا ہے جو زمین کے اوپر اسے حاصل ہے۔ زمین فٹ بال کی مانند ایک بڑا سا گولا ہے جو خلا (space) میں تیز رفتاری کے ساتھ سورج کے اردگرد گھوم رہا ہے۔ اسی طرح ایک جہاز انسانوں کو لیے ہوئے زمین کی فضا میں پرواز کرتا ہے۔ خلا میں گردش کرنے والے اس کرہ (planet) پر انسان آباد ہے۔ زمین کی اس مسلسل گردش میں اگر ذرا سا بھی خلل پڑ جائے تو ایک لمحہ میں نسلِ انسانی کا خاتمہ ہو جائے۔ جس

طرح فضا میں پرواز کرتے ہوئے جہاز میں اگر کوئی خرابی پیدا ہوجائے تو وہ اپنے اندر موجود تمام مسافروں کی ہلاکت کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

کرۂ زمین پر اپنی اس غیر محفوظیت کو انسان اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، اس لیے وہ اس کو محسوس بھی نہیں کر پاتا۔ ہوائی جہاز آدمی کی اسی غیر محفوظ حالت کا محدود سطح پر ایک وقتی مظاہرہ ہے۔ ہوائی جہاز انسان کی حیثیتِ عجز کی گویا ایک مشینی یاد دہانی ہے۔ اس دنیا کی ہر چیز اس لیے ہے کہ آدمی اس سے روحانی تجربہ حاصل کرے۔ مگر یہ روحانی تجربہ صرف اس کے حصہ میں آتا ہے جو میٹر میں نان میٹر کو دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

بیت المقدس میں دعا

اسرائیل کے سفر میں 29 اپریل 1995 کو دوسری بار مسجد اقصیٰ میں داخل ہوا اور دو رکعت نماز ادا کی۔ اس وقت اسرائیل کے اعتبار سے 9 بجے صبح کا وقت تھا اور ہندستان کے لحاظ سے ساڑھے گیارہ بجے کا۔ نماز پڑھتے ہوئے دل بھر آیا۔ سجدہ میں روتے ہوئے دعا کے یہ الفاظ نکلے کہ خدایا! زمانہ کا فرق تیرے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ تو میرے لیے زمانی دوری کو ختم کر دے۔ مجھ کو اس مقدس جماعت کی صفوں میں شریک کر دے جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں امامت کر رہے تھے اور ان کے پیچھے انبیاء صف باندھ کر نماز ادا کر رہے تھے۔

تعمیرِ دنیا، تعمیرِ شخصیت

ایک ہوائی سفر میں اسرائیلی ایئر لائنز (EL AL) کا فلائٹ میگزین (جولائی-اگست 1995ء) دیکھا۔ اس میں کثرت سے مکانات کے اشتہار تھے۔ مختلف کمپنیوں کے بنائے ہوئے مکانات کی خوب صورت تصویریں اور ان کے نیچے اس طرح کے خوش کن الفاظ لکھے ہوئے تھے — آپ کے خوابوں کا گھر اسرائیل میں موجود ہے (Your dream home in Israel) یا یہ کہ اس خوبصورت کامپلکس میں اپنے لیے ایک اپارٹمنٹ حاصل کیجیے اور دنیا کی جنت میں رہنے کا لطف اٹھائیے۔ میں نے ایک اسرائیلی مسافر کو یہ اشتہارات دکھا کر اس کا تاثر پوچھا۔ اس نے کہا کہ ہم نے خوبصورت قسم کے رہائشی مکانات تو ضرور بنا لیے ہیں، مگر ایک نامعلوم خوف ہر

یہودی کے دماغ میں ہوتا ہے کہ کیا معلوم، کب کہاں ایک بم پھٹ جائے۔

یہ صرف اسرائیل کا معاملہ نہیں ہے۔ قرآن کے مطابق، موجودہ دنیا انسان کے لیے پرفیکٹ ورلڈ نہیں ہے، یہ دنیا انسان کے لیے دارالکبد ہے (90:4)۔ اس دنیا میں انسان کو کبد یا عُسر (hardship) کے اندر پیدا کیا گیا ہے۔ یہاں انسان کو مختلف قسم کے حزن (sorrow) کا تجربہ ہوتا ہے۔ یہاں اس کو ہر قدم پر محدودیت (limitations) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہاں انسان کے لیے فُل فِل مینٹ (fulfillment) کا سامان موجود نہیں ہے۔ یہاں تکلیف ہے۔ یہاں بورڈم (boredom) ہے، وغیرہ۔ اس کا تجربہ دنیا کے ہر کونے میں رہنے والے ہر مرد اور ہر عورت کو کسی نہ کسی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔

اس کے بالمقابل قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ جنت جب جنت میں داخل ہوں گے اور وہاں کے ماحول کا تجربہ کریں گے تو ان کی زبان سے نکلے گا: اُس اللہ کا شکر ہے جس نے خوف وحزن کو ہم سے دور کر دیا (35:34)۔ اسی طرح قرآن میں دوسرے مقام پر یہ ہے: تمہارے لیے وہاں ہر چیز ہے جس کا تمہارا دل چاہے اور تمہارے لیے اس میں ہر وہ چیز ہے جو تم طلب کرو گے (41:31)۔

دونوں دنیاؤں کے فرق کو سامنے رکھنے سے انسان کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ موجودہ دنیا میں تعمیرِ جنت کی جدوجہد کرنے کے بجائے آخرت کی جنت کے لیے اپنے اندر ربانی پرسنالٹی تعمیر کرے۔

اطمینان کی متلاشی دنیا

1991 میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے پونے کا سفر ہوا۔ کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں ایک 36 سالہ جرمن خاتون ڈیلی گیٹ Mrs. Ursula McLackand تھیں۔ انہوں نے ایک میٹنگ میں اپنا تجربہ بتایا جو بہت سبق آموز تھا۔ وہ تجربہ، ان کے الفاظ میں، یہ تھا:

> The highest value in the eyes of the German youths is to become independent. Personally, I don't agree. I was educated to look forward to lead an independent life away from my family as soon as I entered university. But, to my surprise, I was lonely and miserable, missing

the interaction with my family. I, therefore, came back to my family. I also joined the German Unification Church to fill the gap in my life. However, I think I am rather an exception. Those of my generation are also not happy but they do not know why that is so. They have lost their conviction, becoming sceptics. One reason of the ever-increasing tourism industry lies in the restlessness found in our generation. It is this dissatisfaction with their lives that they are attracted to travelling, in search of some happiness, and fulfillment in life.

جرمن نوجوانوں کی نظر میں سب سے زیادہ قابل قدر چیز آزاد ہونا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ میری تعلیم اس ڈھنگ پر ہوئی کہ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں اپنے خاندان سے باہر اپنے لیے ایک آزادانہ زندگی گزاروں۔ مگر جب میں نے ایسا کیا تو تعجب خیز طور پر میں نے پایا کہ میں تنہا ہوگئی ہوں اور مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ میرے خاندان سے میرا رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ آخر کار میں اپنے خاندان کی طرف واپس آئی۔ مزید میں یونی فیکشن چرچ سے وابستہ ہوگئی تا کہ میں اپنی زندگی کے خلا کو پُر کرسکوں۔ تاہم میرا خیال ہے کہ میں جرمنی میں ایک استثناء ہوں۔ میری نسل کے اور جو لوگ ہیں وہ خوش نہیں ہیں مگر وہ نہیں جانتے کہ ایسا کیوں ہے۔ انھوں نے یقین کو کھو دیا ہے۔ وہ شک میں مبتلا ہیں۔

آج کل مغربی سیاحوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ یہ لوگ خوشحال زندگی (luxurious life) گزارنے کے باوجود اپنی زندگی سے غیر مطمئن ہیں، اس لیے وہ اپنے مقامات سے نکل کر اِدھر اُدھر جا رہے ہیں تا کہ وہ زندگی میں خوشی اور اطمینان کو تلاش کرسکیں۔ منشیات وغیرہ میں اضافہ کا سبب بھی یہی ہے۔ یہ صورتِ حال مسلمانوں کو اس بات کا موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ قرآن کے پیغام کو ساری دنیا میں انسانوں کی قابلِ فہم زبان میں عام کریں، تا کہ لوگوں کو حقیقی معنوں میں اللہ تعالیٰ کی یاد سے اطمینان حاصل ہو۔

جنت کا تصور

ڈارون نے اپنی کتاب 'ڈسنٹ آف مین' میں لکھا ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے چڑیوں سے بولنا سیکھا۔ یہ بلاشبہ ایک فرضی قیاس ہے۔ میرا اپنا حال یہ ہے کہ میں چڑیوں کو جب

دیکھتا ہوں تو مجھے جنت کا ماحول یاد آتا ہے۔ چڑیاں مجھے جنتی مخلوق جیسی نظر آتی ہیں۔ چڑیوں کے ہر فعل میں اتنا حسن ہے کہ ان کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ چڑیوں کو خدا نے اِس دنیا میں رکھا، تا کہ انسان جنت کا تصور کر سکے۔ چڑیوں کا چہچہانا، چڑیوں کا اڑنا، چڑیوں کا اترنا، چڑیوں کی صورت ہر چیز میں ایک عجیب وغریب کشش ہے۔

جنت، اعلیٰ افراد کی سوسائٹی

میرا تجربہ یہ ہے کہ لوگوں کے اندر سب سے زیادہ جس چیز کی کمی ہے، وہ ہے آرٹ آف تھنکنگ۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی کو سوچنے کا فریم ورک معلوم ہو اور اسی کے مطابق، وہ سوچے لیکن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ اِس بنیادی چیز سے بے خبر ہیں، مسلمان بھی اور غیر مسلم بھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہر آدمی حیوان بشکل انسان بنا ہوا ہے۔ کل ایک صاحب سے بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ جنت میں حوریں ملیں گی، مگر میرے نزدیک، جنت میں جو سب سے زیادہ قیمتی چیز ملے گی، وہ انٹلیکچول پارٹنرس (Intellectual Partners) ہیں۔ اِس حقیقت کو قرآن میں اِن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: وَحَسُنَ أُولئِكَ رَفِيقاً (4:69)۔ یعنی، کیسی اچھی ہے ان لوگوں کی رفاقت۔

جنت میں ایسے انسان ملیں گے جن سے بات کر کے خوشی ہو، جس کے اندر اعلیٰ درجے کا آرٹ آف تھنکنگ ہو، جو حقیقی معنوں میں سچے انسان ہوں۔ جنت میں یہ ہوگا کہ پوری تاریخ سے اعلیٰ انسان منتخب کر کے جمع کر دیے جائیں گے۔ جنت منتخب افراد کی سوسائٹی ہوگی، جب کہ موجودہ دنیا غیر منتخب افراد کا جنگل ہے۔

صلاۃ اسپرٹ

فرینکفرٹ ایر پورٹ (جرمنی) پر میں نے 4 مئی 1990 کو فجر کی نماز پڑھی۔ ایک جرمن خاتون میری نماز کو غور سے دیکھتی رہی۔ جب میں فارغ ہو کر اٹھا تو اس نے معذرت کے ساتھ پوچھا "کیا آپ یوگا کا عمل کر رہے تھے"۔ میں نے کہا نہیں، میں صلاۃ کا عمل کر رہا تھا۔ وہ یوگا کو جانتی تھی، مگر وہ صلاۃ کو نہیں جانتی تھی۔ اس نے پوچھا کہ صلاۃ کیا چیز ہے۔ میں نے کہا، کیا آپ خدا کو مانتی ہیں۔ اس نے کہا ہاں، میں نے کہا کیا آپ مانتی ہیں کہ خدا ہمارا خالق اور رب ہے۔

اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا پھر نماز اسی خالق اور مالک کی عظمت اور اس کے احسان کا اعتراف ہے۔ خدا صبح لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے میرے لیے دن کو روشن کیا تاکہ میں کام کروں۔ خدا شام لاتا ہے تو ہم جھک کر کہتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے کہ تو میرے لیے رات لایا تاکہ میں آرام کروں۔ اس طرح ہم رات اور دن میں پانچ بار خدا کی عظمت اور اس کے انعامات کا اعتراف کرتے ہیں۔ جرمن لیڈی بہت غور سے میری بات کو سنتی رہی۔ اس کے بعد تھینک یو، تھینک یو کہتی ہوئی چلی گئی۔

تھنکنگ اِن دی اسکائی

ایک ہوائی سفر میں میری سیٹ پر ایک خوبصورت سا پمفلٹ تھا۔ اس پر لکھا ہوا تھا: آسمان میں خریداری (shopping in the sky)۔ اس پمفلٹ میں بتایا گیا تھا کہ دورانِ پرواز آپ جہاز کی "مارکٹ" سے کیا کیا چیز خرید سکتے ہیں۔ میں نے مذکورہ جملہ پڑھا تو معاً مجھے خیال آیا کہ دوسرے مسافروں کا کیس اگر "شاپنگ اِن دی اسکائی" ہے تو میرا کیس "تھنکنگ اِن دی اسکائی" کہا جاسکتا ہے۔ کیوں کہ میرا ذہن ہمیشہ سوچنے میں لگا رہتا ہے۔ پھر خیال آیا کہ دنیا کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

دنیا میں بیشتر لوگ "شاپنگ" کو اصل کارنامہ سمجھتے ہیں۔ یعنی دنیا کی مارکیٹ میں جو چیزیں مل رہی ہیں، اس کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ اپنے لیے سمیٹ لیں۔ کچھ لوگ ظاہری مادی سامان خریدتے ہیں اور کچھ لوگ اخباری شہرت، عوامی مقبولیت، اسٹیج کی لیڈری کو سب سے بڑی چیز سمجھ کر اس کو حاصل کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ سب سے بڑی چیز جو اس دنیا سے حاصل کی جائے وہ تدبر ہے جس کو قرآن (3:191) میں ذکر و فکر کہا گیا ہے۔ یہ کچھ مخصوص قسم کے الفاظ کی تکرار نہیں ہے۔ یہ دراصل ذہنی تخلیق کا ایک عمل ہے۔ آدمی روزمرہ کے واقعات اور مشاہدات پر غور کرکے اُن کو روحانی تجربے میں کنورٹ کرتا ہے۔ وہ دنیا کے مادی واقعات سے ربانی سبق حاصل کرتا ہے۔ وہ عالمِ ظاہر سے ایک عالمِ روحانی تعمیر کرتا ہے۔ اسی کا نام ذکر و فکر ہے۔

ہر چیز امتحان ہے

قدیم زمانہ میں شولاپور میں دیوگری یادو کا راج تھا۔ پھر وہ مسلم بہمنی سلطنت کا جزء بنا۔ اس کے

بعد اس پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ 1947ء سے وہ تقسیم کے بعد بننے والے ملک (بھارت) کا ایک حصہ ہے۔ یہی مطلب ہے قرآن کی اس آیت کا جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان ایام کو ہم لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (3:140)۔

حکومتی اقتدار اس دنیا میں کسی ایک گروہ کی میراث نہیں ہے۔ یہ خدا کی سنت ابتلاء کے تحت بدلتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کبھی ایک گروہ کو سیاسی غلبہ دیتے ہیں اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ قرآن کے مطابق، سیاسی اقتدار کسی گروہ کو ملے تب بھی وہ اس کے لیے امتحان ہے اور کسی گروہ سے سیاسی اقتدار چھن جائے تب بھی وہ اس کے لیے امتحان (6:165)۔ آدمی کو چاہیے کہ دونوں حالتوں میں وہ اپنی ذمہ داریوں پر دھیان دے، نہ کہ اقتدار ملنے پر احساس برتری میں مبتلا ہو اور اقتدار چھنے تو احساس کمتری کا شکار ہو جائے۔

مومنانہ مزاج

15 دسمبر 1992ء کو صبح 8 بجے دہلی سے بمبئی کا سفر ہوا۔ جہاز میں انڈین ایکسپریس (15 دسمبر) کا مطالعہ کیا۔ اس میں ایک خبر یہ تھی کہ بھوپال میں تبلیغی جماعت کا سالانہ اجتماع 21-19 دسمبر کو ہونے والا تھا۔ توقع کے مطابق اس اجتماع میں دو لاکھ آدمی شریک ہوتے۔ مگر فسادات کی وجہ سے بھوپال میں ابھی تک کرفیو چل رہا ہے، اس لیے ریاستی انتظامیہ کو تشویش ہوئی۔ مدھیہ پردیش کی حکمراں پارٹی (بی جے پی) نے بدل کے طور پر یہ تجویز کیا کہ اجتماع کو مختصر طور پر غیر نمایاں انداز میں کیا جائے اور تبلیغی جماعت کے لوگ راضی ہو گئے:

> As an alternative, the ruling party leaders have requested the organisers to keep it a low-key affair and they have agreed (p.12).

یہ نہایت صحیح فیصلہ ہے۔ اس طرح کے نازک مواقع پر اگر اس طرح ایڈجسٹمنٹ کا طریقہ اختیار کیا جائے تو بیشتر سماجی جھگڑے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اسی مومنانہ مزاج کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ مومن کی مثال میدان میں اگی ہوئی گھاس کی مانند ہے۔ اِدھر کی ہوا چلی تو اُدھر جھک گیا اور اُدھر کی ہوا چلی تو اِدھر جھک گیا۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر 2810؛ صحیح البخاری، حدیث نمبر 5644)

ڈائری 1986

21 مئی 1986

محمود عالم صاحب (مہاراشٹر) اپنے ایک دوست کے ساتھ ملنے کے لیے آئے، وہ کئی سال سے الرسالہ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے آپ کے مشن سے اتفاق ہے۔ مجھے بتائیے کہ میں عملی طور پر اس کے لیے کیا کروں؟

میں نے کہا کہ سب سے پہلا کام یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قائم کریں۔ الرسالہ کی ایجنسی ہمارے یہاں بنیادی کام ہے۔ اس سے بقیہ کاموں کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ میں فوراً الرسالہ کی ایجنسی شروع کردوں گا۔ مگر یہ بتائیے کہ شاہ بانو بیگم جیسے مسائل کا حل آپ کے نزدیک کیا ہے؟

میں نے کہا کہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے، نہ کہ کوئی قانونی مسئلہ۔ اس قسم کے مسائل کی جڑ یہ ہے کہ لوگوں کے ذہنوں میں بگاڑ آ گیا ہے۔ لوگوں کے دل ضد اور انتقام کے جذبات سے بھرے ہوئے ہیں۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو ان کے لیے کوئی قانون رکاوٹ نہیں بنتا۔ وہ ایک طرف سے اپنا راستہ بند دیکھ کر دوسری طرف سے اپنے انتقامی جذبات کی کارروائی کے لیے راستہ پا لیتے ہیں۔

الرسالہ کے ذریعہ لوگوں کی ذہنی تعمیر کا کام کرتے ہوئے دوسرا کام یہ کرنا ہے کہ ہر بستی میں اصلاحی کمیٹیاں بنائی جائیں۔ ان کمیٹیوں کے ارکان وہ لوگ ہوں جو بستی میں معزز حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اصلاحی کمیٹی بستی کے مسلمانوں پر نظر رکھے اور جس شخص یا خاندان میں کوئی بگاڑ دیکھے فوراً وہاں پہنچ کر اس کو پرامن انداز میں حکمت کے ساتھ درست کرنے کی کوشش کرے۔ آپ اپنی بستی میں ایک اصلاحی کمیٹی بنا کر یہ کام شروع کر سکتے ہیں۔

اصلاحی کمیٹی کا کام اپنی نوعیت کے اعتبار سے تقریباً وہی ہے جس کا ذکر سیرت کی کتابوں میں حلف الفضول کے نام سے آتا ہے۔ حلف الفضول اسی قسم کی ایک اصلاحی کمیٹی تھی جو مکہ کے لیے بنائی

گئی تھی۔ اگرچہ یہ نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے، مگر اس کی اسلامی اہمیت اس طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ نبوت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر مجھے اس میں بلایا جائے تو میں ضرور اس میں شرکت کروں گا: لَوْ أُدْعَى بِهِ فِي الْإِسْلَامِ لَأَجَبْتُ۔ (سیرت ابن ہشام، جلد 1، صفحہ 134)

محمود عالم صاحب نے اصلاحی کمیٹی کی تجویز سے صدفی صد اتفاق کیا اور کہا کہ واقعتاً یہی ہمارے مسئلے کا حل ہے۔

22 مئی 1986

میری کتاب "تعبیر کی غلطی" پہلی بار اگست 1963 میں چھپی تھی۔ جلد ہی اس کے تمام نسخے ختم ہو گئے۔ اس کے بعد مسلسل اس کا تقاضا ہوتا رہا۔ مگر میں اس کو دوبارہ چھپوا نہ سکا۔ اب اپنے ساتھیوں کے اصرار پر دوبارہ اس کو کتابت کے لیے دے دیا۔ آج کاتب صاحب نے کتابت مکمل کر کے اس کے صفحات میرے حوالے کیے ہیں۔

کتاب دوبارہ کتابت ہو کر سامنے آئی تو ماضی کی بہت سی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس میں سے ایک صوفی نذیر احمد کاشمیری کا تبصرہ تھا۔ وہ اس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں صفدر صاحب مرحوم کے ساتھ کام کرتے تھے۔ میری ملاقات ان سے انوار علی خاں سوز کے مکان پر ہوئی۔ صوفی نذیر احمد کاشمیری نے کہا کہ آپ کی کتاب کے مباحث تو تقریباً درست ہیں۔ مگر اس کا نام غلط ہے۔ اس کا نام ہونا چاہیے "ترتیب کی غلطی"۔ انہوں نے کہا کہ مودودی صاحب کی اصل خطا یہ ہے کہ انہوں نے دین کے اجزا کی ترتیب کو غلط کر دیا ہے۔ سیاست وحکومت بھی دین میں ضروری ہے، مگر اس کو صحیح ترتیب پر ہونا چاہیے۔

جو حضرات مولانا مودودی صاحب کے مخالف ہیں (مثلاً امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر اسرار احمد)۔ ان سب کا کیس یہی ہے۔ وہ لوگ ممکن ہے کہ صدفی صد صوفی نذیر احمد والے الفاظ نہ بولیں، مگر عملاً سب کا ذہن وہی ہے جس کی نمائندگی "ترتیب کی غلطی" کے فقرہ سے ہوتی ہے۔

میں ذاتی طور پر اس نظریہ کو غلط سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حضرات اپنے آپ کو سیاست کے خول سے باہر نہ نکال سکے۔ دوسری طرف مولانا مودودی کا فکر ان کو درست بھی نظر نہیں آتا۔ ان دوطرفہ تقاضوں کی تطبیق انہوں نے اس طرح کی کہ انہوں نے کہہ دیا کہ مولانا مودودی کا فکر بذات خود غلط نہیں۔ البتہ انہوں نے اجزائے دین کی ترتیب کو غلط کر دیا۔ حالانکہ ”ترتیب“ ایک اضافی لفظ ہے۔ تحریکوں میں کبھی جامد ترتیب نہیں ہوا کرتی۔

23 مئی 1986

آج کے اخبار میں صفحہ اول پر ایک تصویر چھپی ہے۔ (میرے سامنے اس وقت ہندستان ٹائمس 23 مئی 1986 ہے)۔ اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ گردوارہ بنگلہ صاحب (نئی دہلی) کے سامنے زائرین کے بہت سے جوتے اور چپل رکھے ہوئے ہیں اور پنجاب کے موجودہ چیف منسٹر مسٹر سرجیت سنگھ برنالا کپڑا لے کر جوتوں کی صفائی کر رہے ہیں۔ تصویر کے نیچے حسب ذیل الفاظ درج ہیں:

Punjab Chief Minister, Surjit Singh Barnala dusting shoes at the Bangla Sahib Gurdwara in New Delhi on Thursday (May 23, 1986) .

اخبار کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ چیف منسٹر نے محض فارملٹی کے طور پر یہ کام نہیں کیا۔ جیسے ہمارے اکثر لیڈر درخت لگاتے ہیں، بلکہ انہوں نے پوری محنت اور سنجیدگی کے ساتھ جوتوں اور چپلوں کی صفائی کی۔ 30 منٹ میں انہوں نے تقریباً 100 زائرین کے جوتے صاف کیے۔

مسٹر برنالا پنجاب کے چیف منسٹر تھے۔ وہ اس کے لیے مجبور نہ تھے کہ اکال تخت کے فیصلہ کے مطابق عام آدمی کی طرح جوتوں کی صفائی کریں۔ مگر ردّ کرنے کا اختیار رکھتے ہوئے بھی انہوں نے اس فیصلے کو قبول کر لیا۔

اس معاملہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ مسٹر برنالا نے اکال تخت کے فیصلہ کو قبول کر کے اپنی قوم کی مذہبی روایت کو بچا لیا۔ اگر وہ اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیتے، جب کہ اس طرح کے معاملات میں ہمارے دوسرے لیڈر کرتے ہیں، تو صدیوں سے قائم شدہ روایت ٹوٹ جاتی۔

موجودہ زمانہ میں 40 سے زیادہ اسلامی ملک ہیں، مگر کہیں بھی مسلمانوں میں ایسے لیڈر نہیں جو روایت کو قائم رکھنے کے لیے اس طرح اپنی ذات کی قربانی دے سکیں۔ ہر مسلم لیڈر کا یہ حال ہے کہ جب بھی اس کی اپنی ذات زد میں آتی ہے وہ فوراً روایت کو توڑ دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلم ملک میں کوئی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ہر چیز اضافی بن کر رہ گئی ہے۔

24 مئی 1986

آج حامد سروری حیدرآبادی (پیدائش 1941) ملنے کے لیے آئے۔ حیدرآباد کے فساد میں وہ سخت زخمی ہوئے تھے اور کئی مہینے کے علاج کے بعد دوبارہ صحت مند ہوئے۔ اس فساد میں ان کی دکان بھی لٹ گئی۔ تاہم میں نے دیکھا کہ وہ منفی ذہن کے شکار نہیں ہوئے۔ اس تلخ تجربہ کے باوجود انہوں نے حقیقت پسندانہ طرز فکر کو نہیں کھویا۔

گفتگو کے دوران میں نے کہا کہ ہندستان میں فسادات کا سبب پچاس فیصد مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر ہیں۔ اگر مسجدوں سے لاؤڈ اسپیکر اتار دیے جائیں تو اس ملک کا آدھا فساد ختم ہو جائے۔ میں نے کہا کہ یہ بات میں ذاتی اپج کے تحت نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ حدیث کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔

امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ کی ایک لمبی روایت نقل کی ہے۔ اس روایت کو آپ مشکوٰۃ المصابیح میں علامات قیامت کے باب میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اس حدیث میں قرب قیامت سے پہلے کے بگاڑ کا ذکر ہے۔ بگاڑ کی جو علامتیں حدیث میں بتائی گئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

وظهرت الأصوات في المساجد (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2358)۔

یعنی، اور مسجدوں میں آوازیں بلند ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان الفاظ میں اسی فتنہ کی پیشین گوئی کی گئی ہے جس کو موجودہ زمانہ میں لاؤڈ اسپیکر کہتے ہیں۔ چونکہ ہندستان میں ہندو مسلم آبادیاں ملی جلی ہیں، اس لیے مسجدوں کے لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں ہندوؤں تک پہنچتی ہیں اور ان کو برابر مشتعل کرتی رہتی ہیں۔ وہ ہمارے خلاف مستقل ٹینشن میں رہتے ہیں اور جب موقع پاتے ہیں مار پیٹ شروع کر دیتے ہیں۔

حامد سروری صاحب نے کہا میں اپنے تجربہ کی روشنی میں تصدیق کرتا ہوں کہ آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ حیدرآباد میں دھول پٹ کی مسجد میں ایسا ہی ہوا۔ وہاں ہم نے لاؤڈ اسپیکر لگایا۔ اور ہندوؤں

کے اعتراض کے باوجود ہم نے لاؤڈ اسپیکر بند نہیں کیا۔ یہاں تک کہ چھ مہینے کے بعد فساد ہو گیا۔

25 مئی 1986

سری لنکا کے شمالی حصے میں ایک بستی ہے جس کا نام ہے تیلی پلائی (Tellippalai)۔ یہاں دُرگا دیوی کا ایک مندر ہے۔ پچھلے سال یہ واقعہ ہوا کہ اس مندر میں چوری ہوئی اور کئی لاکھ روپے کے زیورات چوری ہو گئے جو کہ دیوی جی پہنے ہوئے تھیں۔

چوری کے ایک سال بعد 24 مئی 1986 کو یہ واقعہ ہوا کہ لوگوں نے دیکھا کہ مندر کے دروازہ پر ایک بڑا سا بیگ رکھا ہوا ہے۔ اس بیگ کو کھولا گیا تو اس کے اندر وہ تمام زیورات موجود تھے جو ایک سال پہلے چوری کیے گئے تھے۔ زیوروں کا یہ بیگ فوراً مندر کے بورڈ آف ٹرسٹیز کے حوالے کر دیا گیا۔

اس چوری کے بعد عام طور پر یہ کہا جا رہا تھا کہ اس کی ذمہ دار تامل ایلام لبریشن آرگنائزیشن (TELO) ہے۔ اس چوری کے بعد مذکورہ تنظیم کو زبردست نقصانات سے سابقہ پیش آیا۔ چنانچہ انہوں نے زیورات کو واپس کر دیا۔ رپورٹ (ٹائمس آف انڈیا، 25 مئی 1986، ص 8) میں کہا گیا ہے:

> The local people, who had accused the Tamil Eelam Liberation Organisation of the robbery, believe the group had now returned the jewellery because they felt that it was goddess Durga's wrath over the theft of her ornaments that brought about their group's near elimination in recent bloody clashes with the rival Liberation Tigers of Tamil Eelam (LTTE).

مذکورہ گروہ نے زیورات کو اس لیے واپس کر دیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ درگا دیوی اس چوری کی وجہ سے ان پر غضبناک ہو گئیں اور ان کو اپنے حریف گروہ کے مقابلہ میں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔

مسلمانوں کے ساتھ بھی اسی طرح کے واقعات پیش آتے ہیں۔ ان کا ایک آدمی ظلم کرتا ہے اور اس کے بعد خدا اس کو تنبیہی سزا میں مبتلا کر دیتا ہے، مگر وہ نہیں چونکتا۔ موجودہ زمانہ میں شاید مسلمانوں کا دل ان لوگوں سے بھی زیادہ سخت ہو گیا ہے، جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے۔ گویا ان کی اس حالت پر

قرآن کے یہ الفاظ صادق آتے ہیں— پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ پس وہ پتھر کی مانند ہو گئے یا اس سے بھی زیادہ سخت (2:74)۔

26 مئی 1986

ہندستان ٹائمس (26 جنوری 1986) میں صفحہ 9 پر ایک مضمون ہے جس کا عنوان ہے:

Benazir Bhutto and Rajiv Gandhi

اس مضمون کو لکھنے والے مسٹر بھابنی سین گپتا ہیں۔ مضمون ان الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

InshaAllah, if Benazir Bhutto becomes prime minister of Pakistan…

اس طرح اس مضمون میں ایک سے زیادہ بار ان شاء اللہ کا لفظ آیا ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں۔ بہت سے غیر مسلم اپنی گفتگو اور تقریر میں ان شاء اللہ کا لفظ بولتے ہیں۔ اور اسی طرح دوسرے اسلامی الفاظ بھی۔

اسلام کی یہ عجیب خصوصیت ہے کہ اس نے ہر معاملہ میں ایسی چیزیں دی ہیں، جن کا کوئی بدل نہیں۔ اس طرح روزمرہ کی گفتگو میں بولنے کے لیے اسلام نے جو الفاظ دیے ہیں آج بھی اس سے بہتر الفاظ کسی دوسری تہذیب نے انسان کو نہیں دیے۔ مثلاً ملاقات کے وقت السلام علیکم کہنا۔ کوئی خوشی کی بات ہو تو الحمد للہ کہنا۔ کسی کام کا ارادہ کرتے ہوئے ان شاء اللہ کہنا۔ کسی کا اچھا کام دیکھ کر ماشاء اللہ کہنا۔ کسی کا اعتراف کرنا ہو تو بارک اللہ کہنا، وغیرہ۔

یہی ہر معاملہ میں ہے۔ مثلاً موت کے بعد اسلام میں جس طرح تجہیز و تکفین کی جاتی ہے، اس سے بہتر طریقہ کسی قوم میں موجود نہیں۔ اور نکاح کا طریقہ جو اسلام میں رکھا گیا ہے، اس سے بہتر طریقہ سوچا نہیں جا سکتا۔

اسلام کے طریقے نہایت سادہ ہیں اور اسی کے ساتھ نہایت بامعنی۔ مگر مسلمانوں نے اپنے تکلفات کے اضافہ سے اسلام کی کشش مجروح کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان اسلام کا پردہ بن گئے ہیں۔ اسلام اور دوسری قوموں کے درمیان مسلمان حائل ہیں۔

27 مئی 1986

آج کے اخبار (ٹائمس آف انڈیا، انڈین اکسپریس 27 مئی 1986) میں ایک دلچسپ خبر شائع ہوئی ہے:

> A helicopter touched down today at La Sante prison in Paris, picked up a prisoner from the rooftop of the jail and then (took) him out in a daring daylight escape. The escapee was identified as Michel Vaujour, 34, who was convicted on March 8, 1985, for armed robbery.

پیرس کی جیل میں ایک 34 سالہ شخص قید تھا۔ مسلح قزاقی کے جرم میں 8 مارچ 1985 کو اسے 18 سال کی سزا ہوئی تھی۔ 26 مئی 1986 کو ساڑھے دس بجے دن میں ایک ہیلی کاپٹر اُڑتا ہوا جیل کی فضا میں آیا۔ وہ اس کی ایک چھت پر اترا اور مذکورہ قیدی کو لے کر اڑ گیا۔ یہ پوری کارروائی صرف 5 منٹ کے اندر مکمل ہوگئی۔ مفرور قیدی کا نام مائیکل واجور بتایا گیا ہے۔

مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں کوئی شخص اسی طرح ہیلی کاپٹر کرایہ پر لے سکتا ہے، جس طرح ہندستان میں کار کرایہ پر حاصل کی جاسکتی ہے۔ چنانچہ ایک 30 سالہ عورت نے ایک تجارتی ادارہ ایئر کانٹنٹ (Air Continent) سے ایک ہیلی کاپٹر کرایہ پر لیا۔ وہ خود اس کو اڑاتی ہوئی جیل کے اوپر پہنچی اور طے شدہ پروگرام کے مطابق قیدی کو لے کر فرار ہوگئی۔

موجودہ دنیا میں کامیابی کا ایک خاص راز یہ ہے کہ بالکل اچانک ایسا اقدام کیا جائے جس کے متعلق فریق ثانی فوری طور پر کچھ نہ سوچ سکے۔ وہ صرف اس وقت بیدار ہو جب کہ کارروائی کامیابی کی حد تک مکمل ہو چکی ہو۔

28 مئی 1986

پیٹر بننسن (Peter Benenson, b. 1921) نے بڑے جذباتی انداز میں 25 سال پہلے ایک مضمون لکھا تھا جو لندن کے اخبار آبزرور (The Observer) میں 28 مئی 1961 کو چھپا تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

The Forgotten Prisoners

مضمون سیاسی قیدیوں (political prisoners) کے بارے میں تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ بے شمار لوگ ساری دنیا میں محض اپنے مختلف عقیدے یا نظریے کی بنا پر سخت سزائیں پا رہے ہیں:

> Open your newspaper - any day of the week - and you will find a report from somewhere in the world of someone being imprisoned, tortured or executed because his opinions or religion are unacceptable to his government.

انہوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا اور کہا کہ نظریہ اور عقیدہ یا اس کے پرچار پر کسی قسم کی بھی پابندی نہیں ہونی چاہیے، الّا یہ کہ آدمی تشدّد کا طریقہ اختیار کرے۔ اس مضمون کی تائید میں دوسرے لوگوں نے بھی مضامین شائع کیے اور بالآخر وہ ادارہ وجود میں آیا جس کو ایمنسٹی انٹرنیشنل (Amnesty International) کہا جاتا ہے۔ اس وقت 150 ملکوں میں اس کے نصف ملین ممبر ہیں۔ اس کا صدر دفتر لندن میں ہے۔

مگر ایمنسٹی انٹرنیشنل اس بات کی مثال ہے کہ انسان حدود کو نہیں مانتا۔ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کا فرق نہیں سمجھ سکتا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے سیاسی قیدیوں کو عذاب دینے کے خلاف جو آواز بلند کی ہے وہ نہایت درست ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کلام نہیں۔ مگر "انسانی حقوق" (human rights) کے تحفظ کا تصور اس کو یہاں تک لے گیا کہ وہ اخلاقی جرائم میں بھی پھانسی کی سزا کے خلاف ہو گیا۔ اس لیے کہ وہ انسانی عظمت (human dignity) کے خلاف ہے۔ وہ غیر انسانی اور ناقابل واپسی سزا ہے:

Inhuman and irrevocable punishment

ایمنسٹی انٹرنیشنل کا مطالبہ ہے کہ death penalty مکمل طور پر ختم کر دیا جائے۔

یہ دوسرا مطالبہ بلاشبہ غلط ہے۔ سیاسی جرم اور اخلاقی جرم میں لازماً فرق کیا جانا چاہیے۔ پھر یہ کہ بعض اخلاقی جرم ایسے ہیں جن کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مجرم کو ایسی سزا دی جائے جو لوگوں میں دہشت (deterrence) پیدا کرے۔ جو دوسروں کے لیے عبرت ناک ہو جائے۔ اسی مصلحت کی بنا پر شدید اخلاقی جرائم کے لیے موت کی سزا ہونا اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ

دوسرے کمتر جرائم کے لیے موت کی سزا نہ ہونا۔ (ٹائمس آف انڈیا، 28 مئی 1986)

29 مئی 1986

"الامۃ" قطر کا عربی ماہنامہ ہے۔ اس کی اشاعت مئی 1986 میں دکتور احمد کمال ابوالمجد کا ایک مضمون (صفحہ 65) چھپا ہے۔ دکتور موصوف عرب کے مشہور اہل قلم میں سے ہیں۔

مذکورہ مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اگلے سالوں میں ہمارا مسئلہ تقدم اور تخلف کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ امت عربیہ کی نسبت سے یہ وجود اور زوال کا مسئلہ ہے۔ امت عربیہ کو اس کی جڑ میں خطرہ درپیش ہے۔ اگر یہ معاملہ اسی طرح جاری رہا تو اندیشہ ہے کہ عرب اور مسلمان ایک قسم کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ کیوں کہ انسانی تہذیب کے بنانے میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ جدید انسانی تاریخ میں ان کے لیے عزت اور سرداری کا کوئی مقام باقی نہیں رہے گا۔

اس کے بالمقابل "الرعد" ریاض سے نکلنے والا ہفت روزہ ہے، اس کی اشاعت 5 مئی 1986 میں صفحہ 11 پر ایک مضمون ہے، جس کا عنوان ہے:

الاسلام ینتشر و ینتصر

یعنی، اسلام پھیلتا ہے اور فتح یاب ہوتا ہے۔ اس دوسرے مضمون کے رائٹر دکتور عبدالقادر طاش ہیں۔ انہوں نے دکھایا ہے کہ موجودہ زمانہ میں دوسرے مذاہب کے افراد کی تعداد گھٹ رہی ہے اور اہل اسلام کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔

ایک ہی وقت میں دو عرب مضمون نگار موجودہ زمانہ میں اسلام کی الگ الگ تصویریں پیش کر رہے ہیں۔ ایک اسلام کو پیچھے جاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ دوسرے کو اسلام آگے جاتا ہوا نظر آتا ہے۔

اس فرق کی وجہ زاویۂ نظر کا فرق ہے۔ اول الذکر نے اسلام کو تہذیب کی نسبت سے دیکھا اور دوسرے نے دعوت کی نسبت سے۔ تہذیب کی نسبت سے آج یقیناً اہلِ اسلام پیچھے ہیں۔ مگر عین اسی وقت دعوت کے اعتبار سے لوگوں کے دل مسخر ہو رہے ہیں اور اسلام برابر بڑھتا جا رہا ہے۔

"تہذیب" کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام پیچھے جا رہا ہے۔ اور "دعوت" کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام آگے جا رہا ہے۔ پھر کیوں نہ اسی میدان میں اپنی کوششوں کو وقف کر دیا جائے جس میں آج بھی اسلام کی پیش قدمی کے لیے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

30 مئی 1986

سیمون ڈی بوئر (Simone de Beauvoir) 1908ء میں پیرس میں پیدا ہوئی۔ 1986 میں 78 سال کی عمر میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یورپ کی آزادیِ نسواں کی حامی خواتین میں اس کا نام سرِفہرست آتا ہے۔

وہ شادی کے طریقہ کی سخت خلاف تھی۔ اس کے نزدیک شادی کا طریقہ عورت کو دوسرے درجہ کا انسان بنانے کے ہم معنٰی ہے۔ اس نے اعلان کے ساتھ کئی مردوں کے ساتھ زندگی گزاری اور اس نے کبھی نکاح نہیں کیا اور نہ بچے پیدا کیے۔ آزادیِ نسواں کے بارے میں اس کی مشہور کتاب فرانسیسی زبان میں 1949 میں چھپی تھی۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ The Second Sex کے نام سے 1953 میں شائع ہوا۔

سیمون ڈی بوئر نے اپنی خودنوشت سوانح عمری بھی شائع کی ہے۔ اس میں وہ لکھتی ہے کہ اس کے عیسائی پس منظر نے اس کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ عورت ہونا اس کو کمتر درجہ کی بات لگتا تھا۔ لیکن اس نے پسند نہیں کیا کہ وہ عورت یا بیوی بن کر رہے:

> Her Christian background had imposed upon her an inferiority complex about being a woman. But she did not want to be a woman or a wife.

ایک حد تک یہ بات کہنا صحیح ہوگا کہ یورپ میں آزادیِ نسواں کی تحریک عیسائیت کے ردعمل میں شروع ہوئی۔ عیسائی عقیدہ عورت کو انسان کی گناہ گاری کا سبب بتاتا ہے۔ اس بنا پر عیسائیت میں عورت کی تصویر ایک حد تک قابل نفرت بن کر رہ گئی ہے۔ اسی کے ردِّ عمل میں آزادیِ نسواں کی تحریک شروع ہوئی۔ مگر وہ ایک حد سے دوسری حد پر جا پہنچی۔ ایک برائی کو ختم کرنے کے نام پر اس نے دوسری برائی پیدا کر دی۔

31 مئی 1986

سید مجاہد حسین (بیڑ، مہاراشٹر) ملنے کے لیے آئے۔ وہ انجینئر ہیں اور دینی جذبہ کے تحت آج کل عربی پڑھ رہے ہیں۔ تقریباً 4 سال سے الرسالہ کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے آپ

کے فکر سے اتفاق ہے۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اور وہ ذکر کے بارے میں ہے۔ آپ اکثر الرسالہ میں لکھتے ہیں کہ ذکر ایک معنوی حقیقت ہے، نہ کہ محض لفظی تکرار۔ انہوں نے کہا کہ میں آپ کی اس بات کو مانتا ہوں، مگر صوفیا کا کہنا ہے کہ بار بار الفاظ کی تکرار سے آدمی کے اندر اس کی روح بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ کیا یہ درست نہیں؟

میں نے کہا کہ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ فقہ کی عبارتوں کو رٹ کر دہراؤ تو اس سے تمہارے اندر تفقہ پیدا ہو جائے گا۔

مثال کے طور پر الموافقات علامہ شاطبی کی مشہور کتاب ہے۔ وہ اصول فقہ پر ہے۔ اگر اس پر قرآن مجید کی طرح اعراب لگا دیا جائے، یعنی ہر حرف اور ہر لفظ پر زیر، زبر، پیش وغیرہ علامتیں لگی ہوئی ہوں تو کوئی بھی اردو داں اس کو پڑھ سکتا ہے۔ اب بتائیے کہ ایک شخص جو معانی کی فہم نہ رکھتا ہو اور الموافقات پر اعراب لگا کر اس کو روزانہ دہراتا ہے تو کیا وہ فقیہ بن جائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ لفظی ذکر سے معنوی ذکر والی کیفیتیں آدمی کے اندر پیدا ہوں۔

ذکر حقیقتاً معرفتِ خداوندی کے زیرِ اثر نکلے ہوئے الفاظ کا نام ہے، نہ کہ محض زبان سے کی جانے والی بے روح لفظی تکرار۔

1 جون 1986

ٹائمس آف انڈیا (29 مئی 1986) کے صفحہ 3 پر ایک اشتہار نظر سے گزرا۔ ایک ہندو نوجوان اپنے گھر سے بھاگ گیا۔ اس کے باپ نے باتصویر اشتہار شائع کیا ہے کہ اس شکل کا بچہ گھر سے بھاگ گیا ہے، جن صاحب کو ملے وہ اسے ہمارے غازی آباد کے پتہ پر پہنچا دیں۔

لڑکے کا نام دنیش ہے اور اس کے باپ کا نام راجندر کمار ہے۔ اشتہار ہندی رسم الخط میں چھپا ہے۔ مگر اس کی بناوٹ تقریباً اردو ہے۔ اشتہار کے الفاظ یہ ہیں:

گم شدہ کی تلاش (गुमशुदा की तलाश)

پریہ دنیش! تم جہاں بھی ہو شیگھر ہی گھر چلے آؤ۔ گھر پر سبھی بے حد پریشان ہیں۔

تمہاری ممی کی حالت چنتا جنک ہے۔

مسلمان عام طور پر یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہندستان سے اردو ختم کی جارہی ہے۔ مگر یہ بات صرف جزئی طور پر صحیح ہے۔ اس کی ایک مثال اوپر کا اشتہار ہے۔

یہ صحیح ہے کہ نئے ہندستان میں اردو رسم الخط کا استعمال کم ہورہا ہے، مگر جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے، وہ بدستور بڑی حد تک زندہ ہے۔ نہ صرف فلم اور ٹیلی ویژن میں بلکہ ہندی اخبارات میں ایک حد تک وہی زبان ہوتی ہے جس کو ہم اردو زبان کہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم اس زبان کو اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں اور برادران وطن اس کو ہندی رسم الخط میں لکھنا پسند کرتے ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بولنے اور سمجھنے کی حد تک اردو زبان ہندستان میں پوری طرح باقی ہے۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کے کرنے کا ایک کام یہ ہے کہ وہ اسلام کی تعلیمات کو ہندی رسم الخط میں چھاپ کر کثیر تعداد میں پھیلائیں۔ سادہ اردو زبان ہر ہندو سمجھ سکتا ہے۔ بشرطیکہ ہندی رسم الخط میں لکھی گئی ہو۔

2 جون 1986

استاد بندو خاں (1880-1955) مشہور فنکار تھے۔ ان کا کام سارنگی بجانا تھا۔ اس فن میں انہوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ تقسیم ہند سے پہلے کا واقعہ ہے۔ ایک بار استاد بندو خاں کو بتایا گیا کہ محمد علی جناح پر کسی شخص نے قاتلانہ حملہ کیا ہے۔ انہوں نے یہ خبر سن کر کہا:

کیا کرتے ہیں وہ، گاتے ہیں کہ بجاتے ہیں۔

اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر آر این ورما لکھتے ہیں:

It certainly showed Bundu Khan's total devotion to music. His unconcern for anything else was so complete that he did not even know who Jinnah was.

یہ یقینی طور پر بتاتا ہے کہ بندو خان نے اپنے آپ کو میوزک کے لیے بالکل وقف کر دیا تھا۔ دوسری چیزوں میں ان کی بے تعلقی اتنی مکمل تھی کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ جناح کون ہیں۔ (ہندستان ٹائمس، 31 مئی 1986)

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی بھی چیز میں کمال پیدا کرنے کے لیے سب

سے زیادہ ضرورت کس چیز کی ہوتی ہے۔ وہ ہے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دینا۔ کسی فن یا کسی کام میں امتیاز کا درجہ حاصل کرنے کے لیے یہ واحد لازمی شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص امتیاز کا درجہ حاصل نہیں کرسکتا۔

آدمی جب کسی چیز میں اتنا گم ہوجائے کہ اس کے سوا ہر چیز اس کی نظر سے اوجھل ہوجائے، اسی وقت اس کو اس چیز میں کمال کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

3 جون 1986

آنکھ انسانی جسم کا بے حد نازک حصہ ہوتا ہے۔ اس کا آپریشن بہت زیادہ نازک کام ہے۔ آنکھ کے بعض آپریشن ایسے تھے جو موجودہ روایتی آلات کے ذریعہ نہیں کیے جاسکتے تھے۔

اس سلسلے میں روس کے ڈاکٹر فیوڈوروف (Svyatoslav Fyodorov) پچھلے دس سال سے تحقیق کر رہے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک ریاضیاتی ماڈل (mathematical model) بنایا، کمپیوٹر کی تکنیک سے مدد لی۔ آخر کار انہوں نے ایک نئی بے حد تیز چھری (super sharp knife) تیار کرنے میں کامیابی حاصل کرلی۔ یہ چھری اسٹیل کے بجائے ہیرے سے تیار کی جاتی ہے اور یہ موجودہ سرجری چھریوں سے سو گنا زیادہ تیز ہے۔

Super thin diamond knife, is one hundred times sharper than the edge of an ordinary razor blade.

قدیم زمانے میں غالباً دھار دار ہتھیار کے طور پر آدمی کے پاس جو چیز ہوتی تھی وہ نوکیلا پتھر تھا۔ اس کے بعد لوہے کے دھار دار اوزار بننے لگے۔ پھر اس کے بعد اسٹیل کا زمانہ آیا۔ اور ریزر بلیڈ جیسی چیز کا بنانا ممکن ہوگیا۔

مگر انسان کی ضرورتیں اس سے بھی زیادہ تیز اوزار کی طالب تھیں۔ اللہ تعالیٰ کو انسان کی اس ضرورت کی خبر تھی۔ اس نے پہلے ہی ہیرا پیدا کر دیا۔ ہیرا اگرچہ محض کاربن کا مجموعہ ہے، لیکن اس کے اندر غیر معمولی حد تک سختی رکھی گئی ہے۔ یہ صرف ہیرے کے لیے ممکن ہے کہ اس کی دھار کو ریزر سے سو گنا زیادہ تیز کیا جاسکے۔

دورِ زوال کی علامت

صبر کیا ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی دنیا میں سیلف ڈسپلن کی زندگی گزارنے لگے۔ وہ اپنی خواہشوں پر روک لگائے۔ وہ لوگوں کے درمیان نو پرابلم (no problem) انسان بن کر رہے۔ سچے مومن کی ایک علامت سیلف ڈسپلن ہے۔

سیلف ڈسپلن (self-discipline) سے دور کرنے کی بہت سی چیزیں ہیں۔ مثلاً ایک سنی ہوئی بات کو بلا تحقیق دوسروں سے بیان کرنا، تکلف کا طریقہ اختیار کرنا، دوسرے انسانوں کو دھکا دے کر آگے بڑھنا، مجلس میں ہنسنا اور مذاق اڑانا، ایک آدمی بول رہا ہو تو اس کی بات ختم ہونے سے پہلے بولنا، وعدہ کرنے کے بعد اس کو پورا نہ کرنا، غیر سنجیدہ گفتگو کرنا، منفی رویہ اختیار کرنا، ایک دوسرے پر فخر کرنا، بات چیت میں بے احتیاطی کا انداز اختیار کرنا، دلیل کے بجائے عیب جوئی کی زبان بولنا، زیادہ بولنا یا زور زور سے بولنا، کھانا اور پانی ضائع کرنا، وغیرہ۔

مثلاً انڈیا کے ایک عالم نے شام کا سفر کیا۔ وہاں ان کے لیے ایک دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ وہاں کھانے کے بہت سے آئٹم تھے، لیکن "شامی کباب" موجود نہیں تھا۔ عالم نے تفریحی انداز میں کہا: آپ کے یہاں کھانے میں بہت سی چیزیں موجود تھیں، لیکن وہ چیز موجود نہ تھی، جس کو آپ کے نام سے منسوب کر کے شامی کباب کہتے ہیں۔ اس پر لوگ ہنس پڑے۔ صاحبِ خانہ نے معذرت کا اظہار کیا۔

سیلف ڈسپلن کی صفت کا نہ ہونا دورِ زوال کی علامت ہے۔ دورِ زوال میں امت کے اندر جو خرابی پیدا ہوتی ہے، وہ دین کی اصل روح کا مفقود ہو جانا اور دین کی ظاہری شکلوں کا باقی رہنا۔ اِس تفریق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امت کے درمیان بظاہر دین کے نام پر طرح طرح کی سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں، لیکن دین اپنی حقیقت کے اعتبار سے عملاً موجود نہیں ہوتا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ظاہری دین داری کے باوجود مسلمان بے اصول زندگی گزارتے ہیں۔ اسی بے اصول زندگی کو مذہبی زبان میں بے صبری کی روش کہا جاتا ہے۔

چھوٹا آغاز

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے انتہائی شدت کے ساتھ کہا "اب ہمیں اپنا مسئلہ خود حل کرنا ہوگا"۔ میں نے کہا کہ اس قسم کے الفاظ محض الفاظ ہیں جن کے کوئی معنی نہیں۔ کیوں کہ استعمال سے پہلے صلاحیتِ استعمال درکار ہوتی ہے اور وہ ہمارے اندر موجود نہیں۔ کوئی عملی منصوبہ پہلے ایک موافق زمین چاہتا ہے۔ ضروری حد تک تیاری (preparation) کے بغیر اقدام کا منصوبہ بنانا ایسا ہی ہے جیسے پل بننے سے پہلے اس پر گاڑی کو چلا دینا۔

یہ سن کر انھوں نے کہا "اس انداز میں سوچنے والے اور کتنے لوگ ہیں"۔ میں نے کہا کہ یہی تو مسئلہ ہے۔ فی الحال ایسے لوگ ضروری تعداد سے بہت کم ہیں، اس لیے ہم کو پہلی کوشش اسی کی کرنی ہے۔ پھر میں نے بے تکلفی کے انداز میں کہا "الرسالہ میں اسی مزاج کو پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مگر آپ لوگ اس کی اشاعت کو بڑھانے کے لیے تعاون نہیں کرتے"۔

"آپ نے بھی کہاں کی بات کہاں جوڑ دی" انہوں نے کہا۔ مطلب یہ کہ کہاں اتنا بڑا عالمی مسئلہ اور کہاں الرسالہ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ناکامی کی سب سے بڑی وجہ ہمارا یہی مزاج ہے۔ آغاز جب بھی ہوگا چھوٹا ہوگا۔ مگر ہم "چھوٹے آغاز" سے شروع کرنا نہیں چاہتے، اس لیے ہم آغاز بھی نہیں کر پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی تیاریوں سے پہلے آگے کا کام نہیں کیا جا سکتا۔ اور ابتدائی تیاری ہمیشہ چھوٹے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔

چھوٹے آغاز کا مطلب ہے لو پروفائل (low profile) میں کام کا آغاز کرنا۔ اِس طریقِ کار کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو فوراً ہی اپنے عمل کے لیے ایک نقطۂ آغاز (starting point) مل جاتا ہے۔ آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ شروع سے آخر تک اپنا کام معتدل انداز میں جاری رکھے۔ اس سے ری ایکشن کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اِس کے بعد یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آدمی اپنی توانائی کو بے نتیجہ کاموں میں ضائع نہ کرے، وہ اپنی پوری توانائی کو صرف نتیجہ خیز کاموں میں صرف کرے، وہ تمام موجود امکانات کو اپنے مشن کے حق میں استعمال کر سکے، اور اپنے حسبِ منشا اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچائے۔

तजुर्बे के बाद

एक अमरीकी महिला लिन्डा बर्टन (Linda Burton) ने अपने पारिवारिक अनुभवों पर एक किताब लिखी है, जिसका नाम है: तुम्हारी जैसी एक तेज स्मार्ट औरत घर पर क्या काम करती है:

What's a Smart Women Like You Doing at Home?

इस महिला की कहानी का खुलासा, उसी के लफ़्ज़ों में यह है कि मेरा घर पर रहने का कोई इरादा नहीं था। मैं एक कम्पनी में पूरे वक़्त (full time) नौकरी करती थी। 33 साल की उम्र में मेरे यहां एक लड़का पैदा हुआ। उसे संभालने के लिए मजबूरी के तौर पर मुझे अपनी नौकरी छोड़नी पड़ी। यहां तक कि मेरे लिए पैसे की तंगी पैदा हो गई और मैंने दोबारा बाहर का काम करना शुरू कर दिया।

मैं अपने बच्चे के लिए शाम का वक़्त और हफ्ते की छुट्टी का दिन दे सकती थी। पर वह नाकाफ़ी थी। अब मैंने उसके लिए एक 'चाइल्ड केयर सेंटर' तलाश किया। मगर एक महीने के बाद ही घटिया होने की वजह से मुझे वह चाइल्ड केयर सेंटर छोड़ना पड़ा। मैं नौकरी छोड़ कर दोबारा घर पर रहने लगी, ताकि बच्चे की देखभाल कर सकूँ। मैं दो साल तक किसी ज़्यादा बेहतर सेंटर की तलाश में रही, यहां तक कि मेरे यहां दूसरा बच्चा पैदा हो गया।

मैंने दोबारा एक नौकरी कर ली और अपने दोनों बच्चों को घरेलू क़िस्म के चाइल्ड केयर सेंटर में डाल दिया। लेकिन मैं इस के काम करने के तरीके से संतुष्ट न हो सकी। आख़िरकार मैंने ख़ुद अपने घर पर व्यक्तिगत सेवाएं हासिल कीं। मैंने पाया कि आप चाहे जितने कायदे कानून बनाएं, कितना ही ज़्यादा पैसा ख़र्च करें मगर यह नामुमकिन है कि एक शख़्स किसी दूसरे के लिए मुहब्बत कर सके:

> In time, my search for childcare taught me a critical lesson: no matter how many licenses we issue, how

> many guidelines we establish or how much money we pay, it is impossible to have quality controls over the capacity of one human being to love and care for another (p. 94).

मैं एक ऐसा शख़्स चाहती थी जो नर्म मिज़ाज और मुहब्बत करने वाला हो, जो मुस्तैद और खुश-मिज़ाज हो, एक ज़िन्दा शख्स जो मेरे बच्चों की रचनाशीलता को बढ़ाए, वह उनको तफ़रीह के लिए बाहर भी ले जाए। बह उनके तमाम छोटे-छोटे सवालों का जवाब दे। वह उनको मीठी नींद सुलाए। आहिस्ता-आहिस्ता और तकलीफ़देह तौर पर मैं इस हैरतनाक एहसास तक पहुंची कि मैं बरसों से जिस शख़्सियत को तलाश कर रही थी वह मेरी अपनी नाक के नीचे मौजूद है, यानी मैं ख़ुद! यह है वह काम जो मेरे जैसी तेज़-तर्रार व स्मार्ट औरत अपने घर में कर रही है:

> I had wanted someone who was loving and tender, with a sense of humour and an alert, lively manner' somebody who would encourage my children's creativity, take them on interesting outings, answer all their little questions, and rock them to sleep. Slowly, painfully, I came to a stunning realization: the person I was looking for was right under my nose. I had desperately been trying to hire me. And that's what a smart woman like me is doing at home. (*Reader's Digest*, August, 1988)

मज़हब की तालीम के तहत समाज का यह उसूल तय किया गया था कि मर्द कमाए और औरत घर की देखभाल करे। इस तरह काम के बटवारे के इस उसूल पर दोनों ज़िन्दगी का कारोबार चलाएं।

यह एक इंतज़ामी बन्दोबस्त था, न कि किसी को बड़ा और किसी को छोटा दर्जा देना। मगर आज के नए दौर में औरतों की आज़ादी का आन्दोलन उठा, जिसने

इस तरीक़े को औरत को छोटा और गुलाम बनाने की साज़िश बताया। और यह नारा दिया कि औरत व मर्द को किसी बंटवारे या हदबन्दी के बिना हर काम करना चाहिए। यह नज़रिया इतना फैला कि औरतों की एक पूरी नस्ल घर से बाहर निकल पड़ी।

तथाकथित समानता के इस तजुर्बे पर अब क़रीब सौ साल बीत चुके हैं। ख़ास तौर पर पश्चिमी दुनिया में इसका तजुर्बा आख़िरी मुमकिन हद तक किया गया है। मगर इन तजुर्बों ने इसका फायदा साबित करने के बजाय सिर्फ़ इसका नुकसान साबित किया है। मौजूदा पश्चिमी समाज में अलग-अलग अन्दाज़ से इसकी मिसालें लगातार सामने आ रही हैं। उन्हीं में से एक मिसाल वह है, जिसे ऊपर दिया गया है।

मज़हब ने मर्द और औरत के काम के बीच यह बंटवारा किया था कि मर्द रोज़ी-रोटी जुटाए और औरत नई नस्ल का चरित्र निर्माण करे:

Man the bread-earner, woman the character-builder.

नई सभ्यता ने इस मज़हबी तालीम को नहीं माना, लेकिन नई सभ्यता के तजुर्बों ने सिर्फ़ यह किया है कि उसने मज़हब की तालीम की सच्चाई को नए सिरे से और ज़्यादा ताक़त के साथ साबित कर दिया है।

पेड़

पेड़ का एक हिस्सा तना होता है और दूसरा हिस्सा उसकी जड़ें। कहा जाता है कि पेड़ का जितना हिस्सा ऊपर होता है लगभग उतना ही हिस्सा ज़मीन के नीचे जड़ के रूप में फैला हुआ होता है। पेड़ अपने अस्तित्व के आधे हिस्से को फला-फूला और हरा-भरा उस वक़्त रख पाता है जबकि वह अपने अस्तित्व के बाक़ी आधे हिस्से को ज़मीन के नीचे दफ्न करने के लिए तैयार हो जाए। पेड़ का यह नमूना इन्सानी ज़िन्दगी के लिए ख़ुदा का सबक़ है। इससे मालूम होता है कि ज़िन्दगी के

निर्माण और स्थायित्व के लिए लोगों को क्या करना चाहिए। एक पश्चिमी विचारक ने लिखा है:

> Root downward-fruit upward. That is the divine protocol. The rose comes to perfect combination of colour, line and aroma atop a tall stem. Its perfection is achieved, however, because first a root went down into the homely matrix of the common earth. Those who till the soil or garden understand the analogy. Our interests have so centred on gathering the fruit that it has been easy to forget the cultivation of the root. We cannot really prosper and have plenty without first rooting in a life of sharing. The horn of plenty does not stay full unless first there is rooting in sharing.

जड़ नीचे की तरफ़ फल ऊपर की तरफ़ यह ख़ुदाई (ईश्वरीय) उसूल है। गुलाब का फूल रंग और खुश्बू का एक उत्कृष्ट योग है, जो एक तने के ऊपर प्रकट होता है। लेकिन उसकी यह उत्कृष्टता इस तरह हासिल होती है कि पहले एक जड़ मिट्टी के अन्दर गई। वे लोग जो ज़मीन में खेती करते हैं या बाग़ लगाते हैं वे इस उसूल को जानते हैं। पर हमको फल हासिल करने में इतनी ज़्यादा दिलचस्पी है कि हम जड़ जमाने की बात आसानी से भूल जाते हैं। हम निश्चय ही तरक्की और खुशहाली हासिल नहीं कर सकते जब तक हम साझा ज़िन्दगी में अपनी जड़े दाख़िल न करें। मुकम्मल खुशहाली सामूहिक ज़िन्दगी में जड़े क़ायम किए बिना संभव नहीं।

पेड़ ज़मीन के ऊपर खड़ा होता है। पर वह ज़मीन के अन्दर अपनी जड़ें जमाता है। वह नीचे से ऊपर की तरफ़ बढ़ता है न कि ऊपर से नीचे की तरफ़। पेड़ जैसे प्रकृति का एक शिक्षक है जो इन्सान को यह सबक़ दे रहा हैः इस दुनिया में अन्दरूनी मज़बूती के बिना बाहरी तरक्क़ी मुमकिन नहीं।

मौत का फ़ैसला

इयान फ्लेमिंग 1908 में लन्दन में पैदा हुआ और 1964 में उसका देहांत हुआ। 1929 से 1933 तक वह मास्को में पत्रकार की हैसियत से रहा। मार्च 1933 में सोवियत रूस की हुकूमत ने पांच ब्रिटिश इंजीनियरों को जासूसी के आरोप में गिरफ्तार कर लिया। मास्को में उनके ऊपर मुकदमा चलाया गया। यह पश्चिमी पत्रकारिता के लिए बहुत महत्त्वपूर्ण ख़बर थी। इस मुक़दमें की कार्रवाई लिखने के लिए यूरोप के जो अख़बारी नुमाइन्दे मास्को पहुंचे, उनमें रायटर का संवाददाता इयान फ्लेमिंग भी था। इयान फ्लेमिंग चाहता था कि वह इस फ़ैसले की ख़बर सबसे पहले यूरोप भेजे।

इस मुक़द्दमे के लिए उसने एक ख़ामोश मन्सूबा बनाया। जिस दिन मास्को के जज मुक़द्दमे का फ़ैसला देने वाले थे, उसने पूरी घटना की दो अलग-अलग रिपोर्ट तैयार कीं। एक रिपोर्ट अपराधियों के सज़ा पाने की स्थिति में और दूसरी रिपोर्ट वह जबकि उन्हें छोड़ दिया जाए।

निश्चित समय पर जैसे ही जजों ने फ़ैसले सुनाए, इयान फ्लेमिंग ने फ़ौरन अपनी रिपोर्ट की खाली जगह भरी और उसी वक़्त टेलिग्राम के ज़रिए उसको अपने यूरोप के दफ्तर के नाम रवाना कर दिया। यह उस मुक़द्दमे की पहली ख़बर थी, जो लन्दन पहुंची। इयान फ्लेमिंग को इसके बाद रायटर ने बड़ी तरक़्क़ी दे दी।

इयान फ्लेमिंग का ज़्यादा दौलत कमाने का शौक उसको उपन्यास लेखन की तरफ़ ले गया। उसने सनसनीखेज उपन्यास लिखने में ज़बरदस्त ख्याति अर्जित की। उसके तेरह उपन्यासों की लगभग दो करोड़ प्रतियां बिकीं और ग्यारह भाषाओं में उनका अनुवाद हुआ। उसका एक उपन्यास डाक्टर नो (Dr. No) एक लाख डालर में बिका। यह कहानी फिल्माई गई और इससे उसको एक लाख डालर और मिले। इयान फ्लेमिंग अब दौलत और शोहरत के आसमान पर था। पर ठीक इसी वक़्त

उसके ऊपर वह वक़्त आ गया जो हर एक के ऊपर आता है। अभी वह सिर्फ़ 56 साल की उम्र को पहुंचा था कि अचानक वह 12 अगस्त 1964 को मर गया।

इयान फ्लेमिंग रूसी जज के फ़ैसले की रिपोर्ट पहले से तैयार कर सकता था, पर वह मौत के जज के फ़ैसले का पहले से अन्दाज़ा न कर सका। ठीक उस वक़्त उसे अपने आपको मौत के हवाले करना पड़ा जबकि वह सबसे ज़्यादा ज़िन्दगी का ख़्वाहिशमन्द हो चुका था।

तरतीब

ऊंची इमारतों में आटोमैटिक लिफ्ट लगी होती है। आप उसके अन्दर दाख़िल होकर बटन दबाते हैं और वह आपको उस मंज़िल तक पहुंचा देती है, जहां आप जाना चाहते हैं।

मान लीजिए कि चार आदमी एक ही वक़्त में लिफ्ट के अन्दर दाख़िल होते हैं। आपको दूसरी मंजिल तक जाना है और बाक़ी लोग दसवीं और ग्यारहवीं मंज़िल पर जाने वाले हैं। अब अगर दूसरे लोग पहले अपने नम्बर वाला बटन दबा दें और आप अपना नम्बर बाद में दबाएं तो ऐसा नहीं होगा कि लिफ्ट पहले ऊपर चली जाए और बाक़ी लोगों को दसवीं और ग्यारहवीं मंज़िल पर उतारे और उसके बाद नीचे आकर आपको दूसरी मंज़िल पर पहुंचाए। बटन दबाने की बेतरतीबी के बावजूद ऐसा होगा कि लिफ्ट पहले दूसरी मंजिल के मुसाफिर को उतारेगी, उसके बाद वह ऊपर की मंज़िलों पर जाएगी।

ऐसा क्यों होता है? बटन दबाने की बेतरतीबी को वह अपने आप किस तरह तरतीब से कर लेती है। इसका जवाब कंप्यूटर है। आधुनिक लिफ्टों में कंप्यूटर लगा होता है। यह कंप्यूटर एक तरह के मशीनी दिमाग़ की तरह काम करता है। वह बटन दबाने की बेतरतीबी को मंज़िल की तरतीब में बदल देता है और लिफ्ट

को 'आदेश' देता है कि मंज़िल की वास्तविक तरतीब के हिसाब से मुसाफ़िरों को ऊपर ले जाए।

आटोमैटिक लिफ्ट ख़ुदा की एक मामूली रचना है। जब ख़ुदा की एक तुच्छ सी रचना में यह क्षमता है कि वह ग़लत तरतीब (क्रम) को सही तरतीब में बदल दे तो यह क्षमता ख़ुद रचनाकार के अन्दर कितनी ज़्यादा होगी?

मौजूदा दुनिया इम्तिहान की दुनिया है। यहां इन्सान को पूरी आज़ादी दी गई है। इस आज़ादी से फायदा उठा कर लोगों ने अपना नाम ग़लत तरतीब के साथ लिख लिया है। कोई तीसरे दर्जे का आदमी है, पर उसने अपना नाम नम्बर एक पर लिखा रखा है। कोई निचली सतह पर बिठाए जाने के काबिल है, पर उसने अपने आपको ऊंची सतह पर बिठा रखा है। कोई है जो सिरे से जिक्र के काबिल नहीं पर वह झूठे तौर पर शोहरत के स्टेज पर जगह हासिल किए हुए है। आख़िर में तमाम ग़लत तरतीब दुरुस्त कर दी जाएगी। इसके बाद तुच्छ दर्जे का आदमी तुच्छ सीट पर पहुंचा दिया जाएगा। और ऊंचे दर्जे का आदमी ऊंची सीट पर।

विकासवाद: एक धोखा

विकासवाद के सिद्धांत (Theory of Evolution) का दावा है कि इन्सान और जानवर दोनों एक ही नस्ल से हैं। इन्सान दूसरे जानवरों ही की विकसित नस्ल है, न कि कोई अलग नस्ल। इस दावे के सिलसिले में जो सवाल पैदा होते हैं, उनमें से एक अहम सवाल यह है कि अगर यह सच है तो बीच की वे नस्लें या प्रजातियां कहाँ हैं जो विकासवाद के अमल के मुताबिक़ अभी मौजूद इन्सान के मुक़ाम तक नहीं पहुंची थीं, वह अभी जानवर और इन्सान के बीच की कड़ी का अंतराल तय कर रही थीं।

इस नज़रिए के हामियों के पास इसके जवाब में अनुमान और अन्दाज़े के सिवा कुछ नहीं है। चार्ल्स डार्विन ने अपनी किताब में बार-बार हम अच्छी तरह अन्दाज़ा कर

सकते हैं' का वाक्य इस्तेमाल किया है। उसका कहना है कि यक़ीनन ऐसा हुआ है, हालांकि अभी हमें इसके तमाम नमूने हासिल नहीं हो सके हैं। इस फ़र्ज़ी यक़ीन की बुनियाद पर एक पूरी वंश परम्परा तैयार कर ली गई है, जो इंसान की नस्ल को बंदर की नस्ल तक जा मिलाती है। बन्दर और इन्सान के बीच की ये कड़ियां तमाम काल्पनिक और फ़र्ज़ी कड़ियां हैं, मगर बिल्कुल ग़लत तौर पर इनको गुमशुदा कड़ियां (missing links) कहा जाता है।

इन ख्याली क़िस्म की गुमशुदा कड़ियों की तलाश पिछले एक सौ साल से जारी है। बार-बार दुनिया को यह यक़ीन दिलाने की कोशिश की जाती है कि फलां गुमशुदा कड़ी हाथ आ गई है। उन्हीं में से एक कड़ी वह है, जिसको पिल्टडाउन मैन कहा जाता है।

पिल्टडाउन मैन को तक़रीबन आधी सदी तक 'महान खोज' कहा जाता रहा। यह समझा जाता रहा कि यह इतिहास से पहले यानी प्रागैतिहासिक काल का वह इन्सान है जो एक तरफ़ इन्सानी खूबियां और विशेषताएं रखता था और दूसरी तरफ़ वह बन्दर (चिम्पैन्जी) के भी गुण रखता था। इतिहास की किताबों में बकायदा इसके हवाले शामिल हो गए। वह कालिजों के कोर्स में पढ़ाया जाने लगा। मिसाल के तौर पर आर० एस० लल की मशहूर किताब आर्गेनिक विकास (Organic Evolution) सात सौ पेज की किताब है और टेस्ट बुक की हैसियत से पढ़ाई जाती है। इसमें इन्सान और जानवरों के बीच की जिन मालूम 'कड़ियों' का ज़िक्र किया गया है वे इस प्रकार हैं:

1. Ape-man of Jawa
2. Piltdown man
3. Neanderthal Man
4. Cro-magnon Man

मगर बाद की शोधों से साबित हुआ कि 'पिल्टडाउन मैन' एक धोखा था। इस सिलसिले में साइंसदानों के तहकीकी नतीजे किताबों और शोध-लेखों में छप चुके

हैं। इसको जानने के लिए इन्सायक्लोपीडिया ब्रिटैनिका (1984) का शोध लेख 'पिल्टडाउन फोरजरी' का अध्ययन काफ़ी है, जिसको आक्सफोर्ड यूनिवर्सिटी प्रेस ने छापा है। चन्द किताबों के नाम हैं:

1. *Bulletin of the British Museum* (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
2. J.S. Weiner, *The Piltdown Forgery* (1955)
3. Ronald Millar, *The Piltdown Men* (1972)
4. *Readers Digest*, November 1956
5. *Popular Science* (Monthly) 1956

चार्ल्स डावसन (Charles Dawson) नामक एक अंग्रेज़ फॉसिल हड्डियां (Fossil Bones) जमा करने का बहुत शौकीन था। 1912 की घटना है कि वह कुछ हड्डियों को लेकर ब्रिटिश म्यूजियम पहुंचा और यह ख़बर दी कि ये टुकड़े उसे दक्षिण इंग्लैंड के एक मुक़ाम पिल्टडाउन (Piltdown) में एक पहाड़ के अन्दर कंकरियों के दरमयान पड़े हुए मिलें हैं। ब्रिटिश म्यूजियम के एक नामी विद्वान डाक्टर आर्थर स्मिथ वुडवर्ड (A. S. Woodward) ने इसमें खास दिलचस्पी ली और बताई हुई जगह पहुंच कर ख़ुदाई के ज़रिए और भी टुकड़े और दांतों के टुकड़े जमा करके उनका अध्ययन शुरू कर दिया।

इन टुकड़ों में सबसे ख़ास एक जबड़े का टूटा हुआ हिस्सा था जो साफ़ तौर पर एक बन्दर का जबड़ा मालूम होता था। मगर उसमें से एक खास चीज़ बन्दर से अलग थी। और वह उसमें लगे हुए दाढ़ के दो दांत थे, जिनकी ऊपर की सतह समतल (Flat) थी, जो कि सिर्फ किसी इन्सानी दांत में ही हो सकती है। तो यह मान लिया गया कि यह जबड़ा किसी इंसान का है। और इसके बाद निहायत आसानी से उसको विकास की एक गुमशुदा कड़ी ठहरा दिया गया। तलाश करने वालों ने जल्द ही पिल्टडाउन के आसपास वह खोपड़ी भी हासिल कर ली जो पिछले दौर के उस इन्सान के सिर पर कुदरत ने पैदा की थी।

उस पहाड़ की खोह में इतिहास से पहले के ज़माने के यानी प्रागैतिहासिक काल के ज़माने के कुछ जानवरों के अवशेष मिले जिनसे यह तय किया गया कि 'पिल्टडाउन मैन क़दीम व प्राचीन कालीन इन्सान है जो पाँच लाख वर्ष पहले ज़मीन पर गुज़रा है। इस तहक़ीक़ और खोज ने दूसरी मालूम की हुई गुमशुदा कड़ियों के मुक़ाबले में इसको प्राचीनतम इन्सान की हैसियत दे दी। चार्ल्स डावसन को अपूर्व सम्मान दिया गया क्योंकि उसने साइंस की एक पेचीदा गुत्थी को हल करने में मदद दी थी।

पत्थर में तबदीलशुदा ये इन्सानी हड्डियां जो हासिल हुई थीं, वे पूरे इन्सानी ढांचे के सिर्फ कुछ हिस्से थे। मगर विशेषज्ञों ने उसके आधार पर कल्पनाशक्ति से काम ले कर पांच लाख साल पहले के इंसान का एक पूरा ढांचा तैयार कर लिया, जो अपने बेढंगे माथे और बन्दरनुमा जबड़ों के साथ चालीस साल तक सांइसदानों के ध्यान का केंद्र बना रहा। मगर 1950 में यकायक पिल्टडाउन मैन की हैसियत को सख्त धक्का लगा जब भूगर्भविज्ञान (Geology) के एक विद्वान डाक्टर केनेथ ऑक्ले (Kenneth Oakley) ने एक रासायनिक तरीके को इस्तेमाल करके इसकी तारीख़ मालूम कर ली थी।

यह एक उसूल है कि कोई हड्डी जितने दिनों तक ज़मीन में दफ्न पड़ी रहेगी वह उतनी ही ज़्यादा एक ख़ास तत्व को जज़्ब करती है, जिसका नाम फ्लोरीन (Fluorine) है, डाक्टर ऑकले की जाँच से मालूम हुआ कि हासिल की गई हड्डियों में जितनी फ़्लोरीन पाई जाती है, उसके लिहाज़ से उसकी उम्र सिर्फ़ पचास हज़ार साल होनी चाहिए न कि पाँच लाख साल।

बाद की खोजों से पता चला कि पिल्टडाउन मैन की खोपड़ी के बारे में ऑक्ले का अन्दाज़ा बिल्कुल सही था। मगर उसी की बुनियाद पर उसने जबड़े की उम्र भी जो उतनी ही मान ली थी, वह सही नहीं थी। जबड़ा हक़ीक़त में मौजूदा ज़माने के एक बन्दर का था, जो फर्ज़ी तौर पर उस खोपड़ी के साथ जोड़ दिया गया था।

ऑक्ले की इस खोज ने पिल्टडाउन को दोबारा एक पहेली बना दिया, क्योंकि पांच लाख साल पहले के एक ढांचे को तो गुमशुदा कड़ी माना जा सकता था, मगर एक ऐसा प्राणी जो सिर्फ पचास हज़ार साल पहले मौजूद रहा हो उसका गुमशुदा कड़ी होना बिल्कुल नामुमकिन था।

इसके बाद 1953 की एक शाम को लन्दन की एक दावत में ऑक्ले की मुलाकात आक्सफोर्ड यूनिवर्सिटी में मानव विज्ञान (Anthropology) के एक प्रोफेसर डाक्टर वैनर (J. Weiner) से हुई। डाक्टर वैनर ऑक्ले की बातों से बहुत प्रभावित हुआ। उसके बाद घर आकर उसने सोचना शुरू किया कि आखिर इसकी हक़ीक़त क्या है? सबसे ज़्यादा हैरानी उसे पिल्टडाउन मैन के दांत के बारे में थी। "एक बन्दरनुमा जबड़े में इन्सानी दांत जो इस तरह समतल हैं जैसे किसी ने रेती से.. यह सोचते हुए अचानक एक नया ख़्याल उसके जेहन में आया, "ऐसा तो नहीं है कि किसी ने रेती से घिस कर इन दांतो को चिकना कर दिया हो।" उसको ऐसा महसूस हुआ जैसे वह हक़ीक़त के करीब पहुंच गया है। अब वह अपने सामने तहक़ीक़ का एक नया मैदान पा रहा था।

वैनर ने अपने एक साथी सर विल्फ्रेड ली ग्रोस क्लार्क (Sir Wilfred Le Gros Clark) को साथ लेकर काम शुरू किया। उसने चिम्पैन्ज़ी (बन्दर की एक किस्म) का एक दाढ़ का दांत लिया। उसको रेत कर समतल कर लिया। इसके बाद उसको रंग कर देखा तो वह बिल्कुल पिल्टडाउन के दांत जैसा दिखाई देता था। इसके बाद वे दोनों ब्रिटिश म्यूज़ियम गए, ताकि पिल्टडाउन मैन के जबड़े हासिल करके उसके बारे में अपने अनुमान की जांच करें। लोहे का एक मज़बूत बक्स, जिस पर मज़बूत पड़े हुए थे और जो ख़ास तौर पर फायर प्रूफ़ बनाया गया था, उसके दरवाजे खुले और उसके अन्दर से पिल्टडाउन के ढांचे के 'पवित्र' टुकड़े निकाले गए, ताकि साइंसी तरीकों के मुताबिक़ उनकी गहरी जाँच-परख की जाए। एक्स-रे मशीन और दूसरे आधुनिक यंत्र हरकत में आ गए। एक खास किस्म का रासायनिक तरीक़ा भी

इस्तेमाल किया गया, जो नाइट्रोजन की कमी को मालूम करके यह बताता है कि उस पर कितना वक़्त गुज़र चुका है।

बैनर का अदांज़ा सही था। इस से मालूम हुआ कि पिल्टडाउन मैन के जबड़े की हड्डी कोई पुरानी हड्डी नहीं थी, बल्कि आम क़िस्म के एक बन्दर से हासिल की गई थी। हड्डी का क़ुदरती रंग चूंकि फॉसिल (Fossil) होने के बाद बदल जाता है, इसलिए जालसाज़ों ने निहायत होशियारी से उसको महोगनी रंग में रंग दिया था। रंग को हूबहू बनाने के लिए कुछ खास चीजें इस्तेमाल की गई थीं। गहरे जायज़े के बाद मालूम हुआ कि दांत की सतह पर ऐसी खरौंचें मौजूद हैं, जिससे लगता है कि दांत कृत्रिम तौर पर रगड़ा गया है। इसके अलावा उसके किनारों में अप्राकृतिक क़िस्म की तेज़ी भी थी, जो कि सिर्फ रेती से रगड़ने ही की स्थिति में हो सकती है।

1953 में इन तीनों खोजकर्ताओं (ऑक्ले, वैनर और क्लार्क) ने ऐलान किया कि जबड़ा और दांत बिल्कुल फर्जी हैं। इसके बाद वैनर ने यह मालूम करने की कोशिश की कि इतना बड़ा फ़रेब आखिर किसने घड़ा? उसने तमाम विवरण जमा करने शुरू किए, मुल्क भर के सफ़र किए, ताकि पिल्टडाउन के वाक़ए से जुड़े हुए जो लोग हैं उनसे बातचीत करें। जो लोग मर चुके थे, वह उनके रिश्तेदारों और दोस्तों से मिला। अख़बार की पुरानी फ़ाइलों से इस सिलसिले की तमाम रिपोर्टें पढ़ डालीं।

इस गहरी खोजबीन के बाद पिल्टडाउन की घटना के तमाम लोग बिल्कुल बरी नज़र आए मगर एक शख़्स (चार्ल्स डासन) अपवाद था, जो इस कांड का हीरो था। तमाम जानकारियां संकेत कर रही थीं कि इस बेबुनियाद बात का अस्ल रचनाकार डावसन ही है।

चार्ल्स डावसन एक कामयाब कानूनदां था। वह इंग्लैंड के उस ख़ास इलाके का रहने वाला था जहां फॉसिल्स बहुतायत से पाए जातें हैं। डावसन को फॉसिल्स में बहुत दिलचस्पी पैदा हो गई। उसका यही शौक और शुगल बन गया कि वह फॉसिल हड्डियां जमा किया करता था। पिल्टडाउन मैन के वाक़ए से पहले वह पुराने दौर के बहुत से जानवरों के ढांचे हासिल करके लन्दन के अजायबख़ाने में भेज चुका था।

बाद में डावसन को वह मज़ाक़ सूझा, जिसने 40 साल से ज़्यादा मुद्दत तक वैज्ञानिकों को धोखे में रखा। डावसन के एक मुलाक़ाती ने बताया कि एक बार वह आवाज़ दिए बगैर डावसन के कमरे में चला गया। उसने देखा कि डावसन कुछ प्रयोग करने में मश्गूल है। वह अलग-अलग बर्तनों में खारी पदार्थ और रंगीन अर्क डाल कर हड्डियों को उसमें डुबोए हुए था। डावसन ने उसको देख कर घबराए हुए अन्दाज़ में कहा कि वह फॉसिल हड्डियों को रंग रहा था, ताकि यह मालूम करे कि कुदरती तौर पर, उनका जो रंग हैं वह कैसे बनता है। इस क़िस्म की कुछ और बातें मालूम हुईं, जिन्होंने इस बात की तस्दीक़ कर दी कि इस घड़े हुए फ़रेब का रचनाकार डावसन है। मगर यह सब उस वक़्त हुआ जबकि इससे बहुत पहले डावसन 1916 में 52 साल की उम्र में अपनी प्रसिद्धि की बुलन्दियों के वक़्त मर चुका था।

डावसन ने अपने झूठ को पूरा सच साबित करने के लिए एक और तरकीब की। उसने पत्थर के कुछ औज़ार पेश किए और बताया कि ये उसे पिल्टडाउन के मुक़ाम पर मिले हैं। यह मान लिया गया कि ये पत्थर के वे औज़ार हैं, जिनसे पाँच लाख साल पहले का अधूरा इंसान काम लिया करता था। मगर बाद की खोजों ने उनको भी बिल्कुल जाली साबित कर दिया। डावसन ने इसी क़िस्म के एक पत्थर का औज़ार हेरी मोरिस (Harry Morise) को दिया था। मोरिस एक बैंक क्लर्क था और पत्थर के पुराने नमूने जमा करने का शौक़ीन था। बाद में मोरिस अपनी जांच से इस नतीजे पर पहुंचा कि यह पत्थर का औज़ार बिल्कुल जाली है। मोरिस ने इस पत्थर को अपनी ख़ास अलमारी में दूसरे नमूनों के साथ रख छोड़ा था। जब वैनर को उस अलमारी का पता चला था तो उसका शौक और उत्सुकता बढ़ी लेकिन इससे बहुत पहले मोरिस मर चुका था।

वह पत्थर कहाँ है? वैनर को यह सवाल परेशान करने लगा। मोरिस के मरने के बाद उसकी अलमारी दो हाथों में जा चुकी थी, फिर भी वैनर ने उसे ढूंढ निकाला। अलमारी खोलने पर मालूम हुआ कि उसके अन्दर बारह खाने हैं, जिनमें बहुत से

नमूने हैं और लेबल लगे हुए रखे हैं। आख़िरी खाने में पिल्टडाउन का पत्थर का औज़ार रखा था। उस पर मोरिस के अपने हाथ से लिखे हुए ये शब्द दर्ज थे:

"Stained by C. Dawson with intent to defraud"

यानी इसको डावसन ने बिल्कुल जाली तौर पर ख़ुद अपने हाथों से रंगा था ताकि दुनिया को धोखा दे कि यह बहुत पुराने ज़माने का औज़ार है। एक नोट में मोरिस ने यह भी बताया था कि हाइड्रोक्लोरिक एसिड पत्थर के भूरे रंग को ख़त्म करके उसको मामूली सफ़ेद रंग के पत्थर में तब्दील कर देता है।

यह वाक़िआ बता रहा है कि पुराने दौर की हड्डियों के टुकड़े जमा करके उनकी बुनियाद पर जो काल्पनिक ढांचे खड़े किए गए हैं, उनकी हकीकत क्या है। बेशक पुराने दौर में कोई डावसन मौजूद नहीं था, जो हमको धोखा देने के लिए इन हड्डियों का हुलिया बिगाड़ देता मगर लाखों और करोड़ों वर्ष तक आंधी तूफान और भूकम्प ज़मीन के ऊपर उलट-पुलट कर रहे थे, उनकी वजह से सारी तब्दीलियां होना मुमकिन है, जिनका आज हमने 'डावसन मैन' के रूप में तजुर्बा किया है। फिर विकासवाद के हामियों के पास वह कौन सा विश्वसनीय ज्ञान है, जिसकी बुनियाद पर वे नामालूम अतीत के बारे में इतनी दृढ़ता और विश्वास से अपना दावा पेश कर रहे हैं?

पापुलर साइंस (Popular Science) का लेखक लिखता है:

> "पिल्टडाउन की ख़्याली दास्तान अब हमेशा के लिए ख़त्म हो चुकी है, मगर एक पहेली अभी तक हल न हो सकी। वह कौन सा मक़सद था जिसके लिए डावसन ने इतना बड़ा झूठ तैयार किया? उसको इस काम से कोई आर्थिक लाभ हासिल नहीं हुआ। ब्रिटिश म्यूज़ियम को उसने जो हड्डियां दी थीं वे उसने महज़ तोहफ़े के तौर पर पेश की थीं। उसने उनकी कोई क़ीमत वसूल नहीं की। फिर क्या शोहरत पाना उसका मक्सद था? क्या इस ज़बरदस्त फ़रेब के ज़रिए वह सिर्फ मज़ाक़ करना चाहता था? उस अंग्रेज जालसाज़ को आख़िर किस चीज़ ने इस काम के लिए मजबूर किया? इस

सवाल का जवाब देना रासायनिक और भौतिक विज्ञानी प्रयोगों के बस से बाहर है। और शायद वह हमेशा एक रहस्य ही रहेगा?"

इससे साबित होता है कि प्रायौगिक ज्ञान (Tested Knowledge) अपनी सीमाओं की वजह से सृष्टि की व्याख्या नहीं कर सकता। वह हमारी दुनिया के सिर्फ कुछ तथ्यों का विश्लेषण कर सकता है, जबकि हमें एक ऐसे ज्ञान की ज़रूरत है जो तमाम तथ्यों का विश्लेषण करे, जो हम पर तमाम हक़ीक़तों को खोल सके। ऐसा इल्म सिर्फ़ 'वहय' (ईश्वरीय संदेश) का इल्म है। उसके सिवा कोई और इल्म इस ज़रूरत को पूरा नहीं कर सकता।

जितना देना उतना पाना

श्री सुरजीत सिंह लांबा (जन्म 1931) 'फ़ोटोग्राफ़िक मेमोरी के मालिक हैं। किसी चीज़ को चन्द बार पढ़ लें तो वह उनको याद हो जाती है। 12 जून 1983 को हमारे दफ्तर में आए तो अल-रिसाला के कई लेख उन्होंने शब्दशः ज़बानी सुना दिए।

श्री लांबा क़ानून मंत्रालय में हैं और दिल्ली में कीर्ति नगर में रहते हैं। वह इक़बाल के रसिया हैं। 'इक़बालियात' (इक़बाल से सम्बन्धित विषय) से उन्हें ख़ास दिलचस्पी है। इक़बाल के हज़ारों शे'र उनको ज़बानी याद हैं और इसी तरह उनकी ज़िन्दगी के हालात भी।

श्री सुरजीतसिंह लांबा मई 1983 में पाकिस्तान गए। वहां इक़बालियात के माहिर की हैसियत से उनका ज़बरदस्त स्वागत हुआ। इस सिलसिले में उनकी मुलाक़ात अमीर हुसैन साहब (लाहौर) से हुई। उन्हें भी इक़बाल के बहुत से शे'र याद हैं। उन्होंने श्री लांबा को चुनौती दी कि अगर तुम साबित कर दो कि तुम्हें इक़बाल के शे'र मुझसे ज़्यादा याद हैं तो मैं अपनी हार मान लूंगा और तुमको पांच हज़ार रुपये इनाम दूंगा। श्री लांबा ने कहाः

मैं पिछले दस साल से इक़बाल रूपी 'शमा' पर 'परवाने' की तरह नृत्य कर रहा हूं। तुम मुझसे ज़्यादा इक़बाल का कलाम उसी वक़्त पेश कर सकते हो जबकि तुमने 'परवाना' बन कर इक़बाल रूपी शमा पर मुझसे ज़्यादा नृत्य (रक्स) किया हो। श्री लांबा इस मुक़ाबले में जीत गए। अमीर हुसैन साहब इक़बाल की जिस नज़्म का कोई मिसरा पढ़ते श्री लांबा लगातार उसके आगे के शेर सुनाना शुरू कर देते। इसके बरअक्स जब श्री लांबा ने इक़बाल का कोई मिसरा पढ़ा तो वह उसके आगे ज़्यादा न सुना सके।

इक़बाल के इस मुक़ाबले में सुरजीत सिंह लाम्बा जीत गए और अमीर हुसैन लाहौरी हार गए। किसी क्षेत्र में सफलता की सबसे ज़रूरी शर्त यह है कि उस क्षेत्र में आदमी अपने आपको पूरी तरह समर्पित कर दे। ज़िन्दगी का हर मामला जैसे एक शमा है। और इस मामले में सबसे ज़्यादा वही शख़्स आगे बढ़ेगा जो सबसे ज़्यादा उस शमा के लिए तड़पा हो, जिसने सबसे ज़्यादा उस शमा के लिए नृत्य किया हो।

ज़िन्दगी लेन-देन का सौदा है। यहां देने वाला पाता है। और उतना ही पाता है जितना उसने दिया हो। यहां न दिए बिना पाना संभव है और न ही यह संभव है कि कोई शख्स कम दे कर ज़्यादा का हिस्सेदार बन जाए।

जिसकी शरारत का असर उसके बाद भी रहे

एक हकीम का कहना है कि बरकत उसके लिए है कि जब वह मरा तो उसके गुनाह भी उसके साथ मर गए। और तबाही उसके लिए है कि जब वह मरे तो उसके बाद उसके गुनाह भी बाक़ी रहें।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

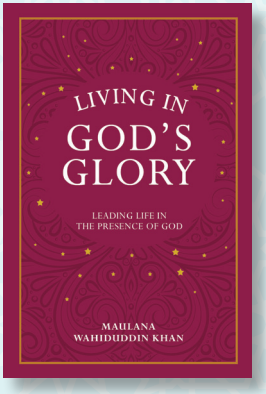

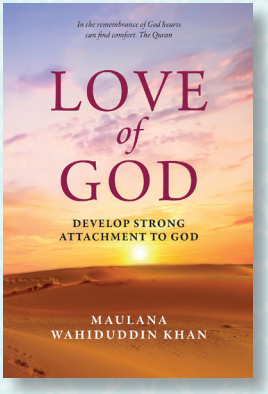

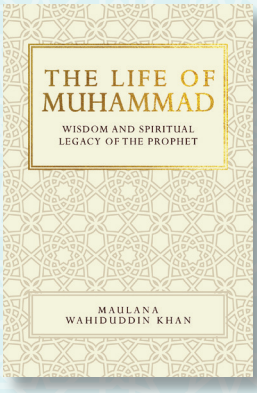

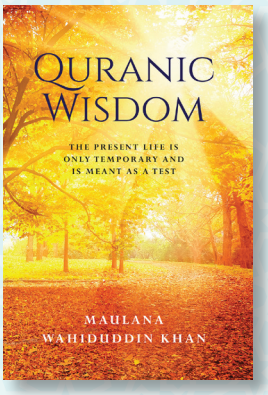

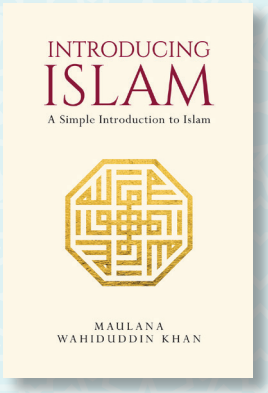

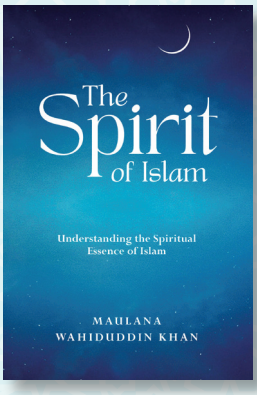

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23